حالات، تعلیم، مضمون نگاری کی ابتدا، اولاد و وفات کا ذکر ہے اور ان کے متعلق اہل علم کے تاثرات اور شعراء کے
باقی اشعار درج ہیں، تیسرے باب میں انکی سیرت و شخصیت کے مختلف جلوے دکھائے گئے ہیں اس سے نجیب صاحب
کی شرافت، مقبولیت و ہر دلعزیزی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ نہایت شگفتہ مزاج اور باغ و بہار شخص تھے مصنف نے
اس کے کچھ دلچسپ نمونے دیے ہیں، چوتھے باب میں انکی تصنیفات، تراجم اور مضامین کی مکمل فہرست اور علمی و
ادبی زندگی کے تین دور کا ذکر ہے، پہلے دور میں رفیق دار المصنفین کی حیثیت سے ان کی کتابوں اور معارف میں
شایع شدہ مضامین پر ریویو اور دوسری نوعیت کے مضامین پر مبسوط تبصرہ ہے، دوسرے میں اردو کے پروفیسر
اور تیسرے میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انکی تصنیف تتاگجری، نوائے ادب اور دوسرے رسالوں
میں چھپے مضامین پر بحث و تبصرہ ہے اور ضمناً انجمن اسلام کا تعارف اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض او خدمات
بیان کیے ہیں، پانچویں باب میں نجیب صاحب کے چند خطوط درج ہیں، چھٹے میں ان کے نظریہ زبان و ادب پر بحث ہے اور
ساتویں میں انکے اسلوب کی خصوصیات دکھائی ہیں اور طرز نگارش کے نمونے بھی نقل کیے ہیں، یہ کتاب وہ مقالہ ہے
جو ایم۔ اے فائنل کیلیے لکھا گیا تھا، گو اس سے نجیب صاحب پر کام کرنے والوں کو آئندہ مدد ملے گی لیکن جو لوگ انکو اچھی طرح
جانتے ہیں انھیں اس کتاب کے پڑھنے کے بعد پوری طرح تشفی نہیں ہوسکتی ہے، ان کی نظر میں یہ کتاب انکی پوری زندگی
پر حاوی نہیں ہے بلکہ یہ انکی زندگی کا ایک سرسری خاکہ ہے نجیب صاحب کے مضمون "پان کی کہانی" کا کئی جگہ ذکر
ہے، ص ۳۰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اسکے سن اشاعت کی تعیین سے قاصر ہیں لیکن ص ۱۰۱ پر اس کا سن اشاعت
۱۹۳۰ء اور ص ۲۵۵ پر ۱۹۳۰ء لکھا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر ندوہ، شبلی اکیڈمی اور دار المصنفین سے بالالتزام
.... (ص ۱۵۱) اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شبلی اکیڈمی اور دار المصنفین کو دو ادارے سمجھتے ہیں، ایک جگہ جناب شاہ
معین الدین احمد ندوی مرحوم کی جانب تاریخ ہند کو منسوب کیا ہے، حالانکہ انکی کتاب "تاریخ اسلام" ہے جناب
سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کو محمد بن قاسم کا مصنف لکھا ہے یہ غلط ہے ص ۲۵۸ پر ۱۹۳۰ء تا ۱۹۵۵ء
تقریباً پندرہ سال لکھا ہے جو غالباً کتابت کی غلطی ہوگی، ایک جگہ بلوغ المرام کو بلاغ المرام لکھا ہے (ص ۲۹) نجیب صاحب کے
اہم تلامذہ میں عبد الرزاق قریشی مرحوم کا نام چھوٹ گیا ہے اور ان سے بہت کم درجہ کے لوگوں کا ذکر ہے، ص ۱۲۰ پر لکھتے ہیں "نجیب صاحب نے
شہزادہ دارا شکوہ کی کتاب کا نام سفینۃ الاولیا دیا ہے جبکہ بقول بعضے سفینۃ الاصفیا ہے، حالانکہ نجیب صاحب نے صحیح لکھا ہے
دارا شکوہ کی سفینۃ الاصفیا نام کی کوئی کتاب ابھی تک دریافت نہیں ہوسکی ہے البتہ اسکی ایک اور کتاب کا نام سکینۃ الاولیا ہے، الناظر کے
انعامی مضمون اردو کا سب سے بڑا انشاپرداز کون ہے کے متعلق تحریر کیا ہے کہ نجیب صاحب کے مضمون کو انعام کا مستحق قرار دیا، یہ خلاف واقعہ ہے انعام کا مستحق

"ض"

جلد ۱۳۰ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۲ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

مغربی بیروت میں فلسطینیوں پر یہودیوں کی مسلسل سفاکانہ بمباری کو اب دو۲ مہینے ہو رہے ہیں، اخباری خبروں کے مطابق وہاں تیس ہزار سے زیادہ افراد لقمۂ اجل ہو چکے ہیں، اس لیے بے چین ہو کر ایک بار پھر عالم اضطراب میں یہ سطریں سپرد قلم ہو رہی ہیں۔

اس ذلیل ترین جارحیت اور خوں ریزی سے انسانیت چیخ اٹھی ہے، اقوام متحدہ کی حفاظتی کونسل اسرائیل کی اس درندگی کے خلاف تجویزوں پر تجویزیں منظور کر رہی ہے، لیکن وہ کسی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، جس کے بعد اس عالمی ادارہ کے لایعنی، بے مقصد اور بیکار ہونے کی رہی سہی کسر پوری ہو رہی ہے، اب یہ محض ایک سیاسی قہوہ خانہ، سیاست دانوں کا ایک شبستان عیش، بڑی طاقتوں کی ذہنی عیاشیوں کی ایک طرب گاہ اور ویٹو کے استعمال کی بازیگری کا ایک سرکس بن کر رہ گیا ہے، پیرک امریکہ کی اس داشتہ کا حشر کہیں وہی نہ ہو جو لیگ آف نیشنز کا ہو چکا ہے، یا شاید [illegible] ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے۔

یہودی یہ نہ سمجھیں کہ ان کو اس علاقہ میں ان کی آرزوؤں کی جنت مل جائے گی، وہ اپنی ریاست کو امریکہ کے سیاسی مصالح کا ایک فوجی کیمپ تو ضرور تصور کریں جو اس کے سیاسی مفاد کے ماتحت آسانی سے ختم بھی ہو سکتا ہے، گذشتہ ڈھائی ہزار برس کی تاریخ میں یہودیوں کو یہاں دیوار گریہ کے پاس پہونچ کر رونے کے علاوہ کوئی اقتدار حاصل نہیں ہوا، حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو۶۰۰ سال پہلے بابل کے حکمراں بخت نصر نے یروشلم کے یہودیوں کو ان کی بدکرداری کی یہ سزا دی تھی کہ اس کو کھنڈر کر کے یہاں سے ایک لاکھ قیدی اپنے ساتھ بابل لے گیا، اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک وہاں ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں اور مسلمانوں کی حکومتیں یکے بعد دیگرے رہیں، لیکن یہودیوں کا یہ وطن نہیں رہا، اب اس کو اپنا وطن بنا لیا ہے تو اس کا کوئی جواز نہیں۔

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہل عرب کا

رسول اللہ صلعم کی نبوت کے بعد سولہ۱۶ مہینے تک بیت المقدس قبلۂ اول رہا، آپؐ کا سفر معراج بھی یہیں سے شروع ہوا، مسلمانوں کی نظروں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے مقدس شہر یہی ہے، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ سے

گیارہویں صدی عیسوی تک اموی، عباسی، طولونی، فاطمی اور سلجوقی فرماں رواؤں نے قبۃ الصخرا اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر کر کے اس شہر کی تزئین و آرائش میں بےشمار دولت صرف کی، گیارہویں صدی میں یروشلم کے لیے صلیبی جنگ شروع ہوئی تو عیسائیوں اور مسلمانوں میں اسی طرح لڑائیاں ہوتی رہیں جس طرح آج یہودیوں سے ہو رہی ہیں، تقریباً چار سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

نوے۹۰ برس کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اپنی بے مثال شجاعت اور قابل فخر تدبر سے کام لے کر مسلمانوں کا پھر اس پر قبضہ کرا دیا، رفتہ رفتہ اس کا نصرانی کردار بالکل جاتا رہا، یہودی صرف دیوار گریہ کے پاس آکر رونے کے سوا یہاں کی ہر چیز سے محروم رہے، یہودیوں نے جب سے حضرت عیسیٰ روح اللہ کی نبوت سے انکار کیا اسی وقت سے ان کے مولد کا امین بننے کے مستحق نہ رہے، اسی طرح جب عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی بشارت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی تکذیب کی تو یروشلم کی امانت ان فرزندان ابراہیم کا حصہ ہو گیا جو نسل ابراہیمؑ کے ہر پیغمبر کو برابر کی عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سولہویں صدی کی ابتدا سے فلسطین دولت عثمانیہ کے زیر نگیں رہا، عیسائی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود عثمانیوں نے اپنی رواداری میں عیسائیوں کو یہاں گرجا، شفاخانے اور یتیم خانے وغیرہ بنانے کی اجازت دے دی تو یہ ان کی سیاسی شر انگیزیوں کے اڈے بن گئے، سلطان عبدالحمید کے عہد میں یہودیوں نے یہ پیشکش کی کہ اگر ان کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دیدی جائے تو وہ ترکی کے تمام قرضے ادا کر دیں گے، سلطان نے اس کو حقارت سے ٹھکرا دیا، پھر بھی یہودی چوری چھپے فلسطین میں داخل ہو کر اور بڑی بڑی قیمتیں دے کر عربوں سے زمین خریدنے میں کامیاب ہوتے گئے۔

پہلی جنگ عظیم کا المناک پہلو یہ ہے کہ عربوں نے ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے بعد انگریزوں نے غداری کر کے فلسطین کو عربوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے قبضہ میں کر لیا اور جس کے بعد یہودیوں کے لیے فلسطین کے دروازے کھول دیے گئے، پھر تو عربوں اور یہودیوں میں خونریز فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا، برطانیہ نے گھبرا کر اس کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر کے صلیبی جنگ کی شکست کا بدلہ لے لیا

یہودیوں کی نئی ریاست اسرائیل کو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں تسلیم کر لیا تو وہ اپنی بدنفسی میں ایک بڑی مملکت کا خواب دیکھنے لگے، فلسطین سے عربوں کو دھکیلنا شروع کیا تو وہ خانماں برباد ہو کر شام، لبنان اور اردن کے کیمپوں میں بے بسی کی زندگی بسر کرنے لگے، ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یہودیوں نے قدیم بیت المقدس اور اردن کے مغربی کنارے پر بھی قبضہ کر لیا، ۱۹۷۳ء کی جنگ میں عرب مقبوضہ فلسطین کو آزاد نہ کرا سکے۔

عیسائیوں نے یہودیوں کو ان کی بدکرداری، بداعمالی اور بدنفسی کی وجہ سے اپنے اپنے ملکوں سے دربدر کر دیا ہے، لیکن فلسطینی مسلمانوں کے مقابلہ میں انھوں نے ان کو ایسا عزیز بنا لیا ہے کہ ع

شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

یہ بین الاقوامی شکست و ریخت کی کرشمہ سازی ہے کہ یہودی تو باہر سے آکر فلسطین میں بسیں، لیکن جو چودہ سو سال سے اپنے گھروں میں آباد تھے ان کو بے گھر کیا جائے، اور جب وہ اپنا گھر واپس مانگیں تو ان پر بمباری کر کے ان کو تباہ کیا جائے، اس میں امریکہ اور لبنان کے عیسائی بھی ان کا ساتھ دیں۔

بے یار و مددگار فلسطینیوں نے مغربی بیروت میں جس ہمت، صبر، پامردی اور بے جگری سے درندہ صفت یہودیوں کی بمباری کا مقابلہ کیا ہے اس کو دیکھ کر ہر حساس انسان اپنی زبان حال سے ان کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ ٭ میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

لبنان میں فلسطینی مسلمان یہودیوں سے نہیں، بلکہ امریکہ کے مہلک اسلحہ اور ان طاغوتی طاقتوں سے پسپا ہوں گے، جن کا مقصد یہ رہا ہے کہ

اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو ٭ آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

مگر یہ چراغ پھونکوں سے بجھایا نہ جائے گا، ان شاء اللہ ان قاتلوں اور اللہ تعالیٰ کے ان مبغوض بندوں سے رہائی کا ابھی آغاز ہے جو صلیبی جنگ کی طرح مدتوں لڑی جائے گی، مسلمان صحیح معنوں میں خیر الامت بن کر اٹھے تو دنیا جس کو ذلیل ترین قوم سمجھتی ہے وہ یہاں سے اسی طرح رو کر نکلے گی جس طرح ابھی حال ہی میں وادی سینا سے روتی ہوئی نکلی ہے۔

مقالات

پروفیسر اجناس گولڈزیہر

از
مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی گڈھ

ولادت ہنگری کے ایک شہر (Székesfehérvár) میں ۲۲ جون ۱۸۵۰ء کو ہوئی، لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا ذوق فطری تھا، اس لئے ابھی عمر پانچ برس کی تھی کہ عہد عتیق کے عبرانی اڈیشن کا مطالعہ شروع کر دیا، آٹھ برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، اسی کا نتیجہ تھا کہ بارہ برس کی عمر میں گولڈزیہر نے عبرانی زبان میں جو مناجاتیں ہیں ان کی اصل اور ان کے اقسام پر ایک مقالہ لکھا اور اسے شائع کرایا، ابھی عمر سولہ برس کی تھی اور وہ اسکول بوائے ہی کہلاتے تھے، کہ گولڈزیہر نے فلسفہ اور قدیم زبانوں مثلاً فارسی اور ترکی کی کلاسوں میں، جو بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوتی تھیں، پابندی اور باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی، اس کی تکمیل کر لینے کے بعد گولڈزیہر کو مزید اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کی طرف سے ایک وظیفہ مل گیا، تو اب وہ جرمنی چلے آئے، اور لیپزگ اور برلن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی، جرمنی سے وہ ہالینڈ گئے، اور لیڈن میں جو اس زمانہ میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کا یورپ میں سب سے بڑا مرکز تھا، چھ مہینے قیام کیا، اس قیام کا نتیجہ یہ ہوا

کہ گولڈزیہر نے اب تک جو کام کیا تھا، اگرچہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا، لیکن اس کا تعلق زیادہ تر یہودی اور سامی زبانوں (جن میں عربی بھی شامل تھی) کے ادب و لٹریچر کے مطالعہ سے تھا، مگر اب یعنی لیڈن میں قیام اور اسلامیات کے درس و مطالعہ کے بعد، جیسا کہ گولڈزیہر نے خود اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے، اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق اور ریسرچ ان کی علمی زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور ستمبر ۱۸۷۳ء سے اپریل ۱۸۷۴ء تک دمشق اور قاہرہ میں قیام کیا، جامع ازہر، قاہرہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ قانوناً ممنوع تھا، لیکن گولڈزیہر نے خصوصی اجازت حاصل کر کے اس میں داخلہ لے لیا اور بحیثیت طالب علم وہاں پڑھنا شروع کر دیا، گولڈزیہر نے جو زمانہ یہاں گذارا اس کو انھوں نے اپنی زندگی کی خوشگوار ترین اور مفید ترین مدت بیان کیا ہے، اگرچہ اپنے والد کی سخت علالت کے باعث جو مرض الموت ثابت ہوئی، وہ قاہرہ میں زیادہ قیام نہ کر سکے، اور وطن لوٹ آئے، پھر یہاں دیکھا کہ ان کے گھر کا تجارتی کاروبار بھی انحطاط پذیر ہے، علاوہ ازیں ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کا اب وہ پہلا سا ہمدردانہ اور حوصلہ افزا رویہ باقی نہ رہا تھا، اور ملک کی سیاسی صورت حال بھی بدل چکی تھی، ان تمام مشکلات اور موانع کے باوجود گولڈزیہر نے باقاعدہ و باضابطہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ انہماک اور کامل توجہ و یکسوئی کے ساتھ جاری رکھا، چنانچہ ۱۸۹۰ء میں وائنا کی امپیریل اکاڈمی کی روداد میں گولڈزیہر کے علمی کارنامہ کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ اور خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں، اور یہی واقعہ ان کی شہرت کا نقطۂ آغاز بنا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہنگری میں سامیوں کے خلاف تحریک بڑے زور شور سے چل رہی تھی، اور اس بنا پر یہودیوں کو اکثر و بیشتر علمی اعزازات و تقررات سے محروم کر دیا گیا تھا، گولڈزیہر بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے، چنانچہ وہ بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامے جن کی دھوم ممالک غیر کے حلقوں میں

مچی ہوئی تھی، خود ان کے اپنے وطن میں ان کی کوئی قدر نہ تھی، یہ زمانہ گولڈزیہر کے لئے بڑا صبر آزما تھا، ۱۸۹۲ء میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی نے گولڈزیہر کو پروفیسر مقرر کیا بھی تو محض آنریری، یعنی پروفیسر کا لقب رکھنے کے باوجود گولڈزیہر کو نہ تنخواہ ملتی تھی اور نہ اور دوسری سہولتیں میسر تھیں جو باتنخواہ پروفیسروں کو حاصل ہوتی ہیں، اور وطن میں ان کے ساتھ یہ معاملہ اس وقت تھا جب کہ ۱۸۸۹ء میں آٹھویں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس نے گولڈزیہر کو ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر افزائی کی غرض سے ایک تمغۂ طلائی دیا اور ۱۸۹۴ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے گولڈزیہر کو ڈبلو رو برٹسن اسمتھ کی جانشینی کی غرض سے پروفیسرشپ کی پیشکش کی تھی، جس کو خود گولڈزیہر نے منظور نہیں کیا تھا

آخر معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر گولڈزیہر نے یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا، جس کو مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کرتے رہے، اس میں اگرچہ تنخواہ کافی تھی، لیکن یہ کام گولڈزیہر کی طبیعت اور مزاج و مذاق کے خلاف تھا، لیکن اس میں مصروفیت کے باوجود شام کے اوقات، تعطیل کے ایام اور ہفتہ وار چھٹی کے دن، جو وقت ملتا تھا، گولڈزیہر اسے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف کرتے اور انھیں شائع کرتے رہتے تھے، جس سے ان کی عظمت اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، انجام کار ۱۹۰۴ء میں عمر میں پہلی مرتبہ ان کا تقرر ایک باقاعدہ و باضابطہ اور باتنخواہ پروفیسر کی حیثیت سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوا، پہلے یہ سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر رہے، ۱۹۱۴ء سے فیکلٹی آف لا کے ماتحت اسلامی فقہ کے صدر شعبہ ہو گئے، ۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہوا، پروفیسر گولڈزیہر کے بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن چند کتابیں نہایت اہم اور بڑی معرکۃ الآرا ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) فرقۂ ظاہریہ، ان کا مذہب

---

[1] یہ معلومات ان کی کتاب اسلامک تھیولوجی اینڈ لا کے ترجمہ کے دیباچہ سے لئے گئے ہیں۔

اوران کی تاریخ" ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ (۲) "اسلامیات کا مطالعہ" یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور اول الذکر کتاب کے چند برس بعد منظر عام پر آئی ہے۔ (۳) اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں گولڈ زیہر کو امریکہ کی طرف سے اسلامی دینیات اور اسلامی فقہ کے عہد بعہد ارتقا پر چھ لکچروں کی دعوت موصول ہوئی، گولڈ زیہر نے یہ دعوت منظور کرکے ایک برس کی مدت میں لکچر تیار کرلئے، لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کمزوری اور چند اور اسباب کی بنا پر گولڈ زیہر کو امریکہ کے سفر کا ارادہ فسخ کرنا پڑا، اور انھوں نے یہ لکچر کتابی شکل میں "اسلامی دینیات اور قانون" کے نام سے چھپوادیا (۴) اس سلسلہ میں چوتھی کتاب جو نہایت اہم ہے وہ "مذاہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے ہے، جس میں تفسیر قرآن کے مختلف مناہج سے بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے۔

یہاں تک ہم نے گولڈ زیہر کے ذاتی اور شخصی حالات وسوانح اوران کے علمی کارناموں کا مختصراً ذکر کیا ہے، آئیے اب اسلامی نقطۂ نظر سے گولڈ زیہر کا بحیثیت ایک نامور مستشرق کے جائزہ لیں۔ جس زمانہ میں گولڈ زیہر بدو شعور کے ناخن لے رہے تھے، وہ زمانہ تھا جب کہ پیام مشرق کے مقدمہ میں علامہ اقبال کے بیان کے مطابق المانوی ادبیات کی تاریخ میں تحریک مشرقی پیدا ہوچکی تھی، گوئٹے کا دیوان اسی تحریک کا نتیجہ تھا، جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر کہتا ہے، "گوئٹے کا دیوان ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے، اس دیوان سے امریکہ کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہوکر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے"۔ یہ تحریک مشرقی جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ شیراز کے دیوان کا مکمل ترجمہ شائع کیا، بعد کے شعرا پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن اسٹاٹ نے اسے تکمیل کو پہنچایا، پلاٹن نے فارسی زبان سیکھی، قافیہ، ردیف اور ایرانی قواعد عروض کی پابندی سے غزلیں اور رباعیاں لکھیں اور نپولین کی مدح میں ایک قصیدہ بھی فارسی زبان

میں لکھا" روکرٹ عربی، فارسی اور سنسکرت تینوں مشرقی زبانوں کا فاضل اور ماہر تھا، علامہ اقبال لکھتے ہیں، روکرٹ کی نگاہ میں مولانا جلال الدین رومی کے فلسفہ کی بڑی وقعت تھی اور اس کی غزلیات زیادہ تر مولانا کی تقلید میں ہی لکھی گئی ہیں، مزید لکھتے ہیں چونکہ روکرٹ السنۂ شرقیہ کا عالم تھا اس لئے اس کی مشرقی نظم کے ماخذ بھی وسیع تھے، مخزن الاسرار نظامی، بہارستان جامی، کلیات امیر خسرو، گلستان سعدی، مناقب العارفین، عیار دانش، منطق الطیر عطار، اور ہفت قلزم وغیرہ جہاں جہاں اسے حکمت کے موتی ملتے ہیں رول لیتا ہے، ...... اسلامی تاریخ کے بعض واقعات بھی اس نے خوب نظم کئے ہیں، رہا بوڈن اسٹاٹ! اس کی نسبت علامہ اقبال رقم طراز ہیں گوئٹے کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن اسٹاٹ ہے، جس نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا، یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ایک سو چالس دفعہ شائع ہوا، اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ عرصہ تک فارسی نظم کا ترجمہ ہی تصور کرتے رہے، یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ گولڈ زیہر کی پیدائش کے وقت تحریک مشرقی نے جرمنی کے ادبی حلقوں میں ایک ایسی فضا پیدا کردی تھی کہ عجمی گلشن علم وادب کی بوئے جاں نواز سے اہل جرمنی کے دل و دماغ مہک رہے تھے، اور وہ اس کے ذریعہ سرور باطن و روح کا سامان کرتے تھے اور (۲) دوسری بات یہ ہے کہ تحریک مشرقی کا مقصد اور اس کی غرض وغایت خالص علمی اور ادبی تھی اور سیاست سے ہرگز اس کا کوئی تعلق نہ تھا،

پروفیسر گولڈ زیہر جو فطرۃً مذاق استشراق لیکر پیدا ہوئے تھے، اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر کس طرح رہ سکتے تھے، چنانچہ، جیسا کہ ہم شروع میں بتا آئے ہیں، گولڈ زیہر کی عمر ابھی

سولہ[16] برس کی تھی کہ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں پر جن میں فارسی اور ترکی زبانیں بھی شامل تھیں، لکچروں میں شامل ہونے لگے، ساتھ ہی شامی زبانوں کی طرف توجہ ہوئی تو عربی زبان بھی سیکھ لی لیڈن میں اسلامیات کا شوق پیدا ہوا تو اس کے درس و مطالعہ میں مصروف ہو گئے، یہاں تشنگی نہ بجھی تو مشرق وسطیٰ کی راہ لی اور حد یہ ہے کہ جامع ازہر، قاہرہ میں داخل ہوئے، یہ گولڈ زیہر کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ غالباً کوئی اور مستشرق اس میں ان کا شریک و سہیم نہیں ہے، جامع ازہر کے ارباب بست و کشاد نے یقیناً گولڈ زیہر میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کے لیے غیر معمولی تڑپ اور لگن محسوس کی ہوگی، اور اب تک جو کچھ انھوں نے لکھا پڑھا تھا اسکی انھوں نے قدر کی ہوگی، جب ہی تو انھوں نے جامع ازہر کی قدیم روایات اور اس کے قواعد و ضوابط کے خلاف ایک یورپین غیر مسلم کو جامع ازہر میں داخلہ کی اجازت دی، پھر تکمیل تحصیل کے بعد جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک دفتری ملازمت کرنے لگے تو اس عالم میں بھی اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ بڑی لگن کے ساتھ کرتے رہے، جس کا نتیجہ نہایت بلند پایہ مقالات و تصنیفات کی شکل میں ظاہر ہوا، یہ سب کچھ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ گولڈ زیہر کو اسلامیات کے ساتھ فطری اور حقیقی لگاؤ تھا، ان کا مقصد زندگی صرف علم کی خدمت تھا، ان کو غرض نہ سیاست سے تھی اور نہ مشنریز کی طرح اسلام یا مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا کرنے سے تھی، اور یہ اس لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مشنریز صلیبی لڑائیوں کے زخم خوردہ تھے، اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رسوائے زمانہ کتابیں لکھ کر کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق اپنے دل کا بخار نکالنا چاہتے تھے، ان لوگوں کے برعکس گولڈ زیہر یہودی تھے اور ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم زدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی معاملات و مسائل میں اپنے آپ کو بہ نسبت عیسائیوں کے مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے،

ان وجوہ کے باعث گولڈ زیہر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا ——— اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے ——— اس کے متعلق بدنیتی کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔"

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ گولڈ زیہر نے غلطیاں نہیں کی ہیں؛ نہیں انھوں نے کی ہیں، اور ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں، (۱) مستشرقانہ غلطیاں اور (۲) علمی غلطیاں مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ یاد کر لینا چاہئے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت و عظمت کا دل و جان سے قائل ہو، بہرحال وہ غیر مسلم ہے، اور اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کرتا ہے، وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے بعض جو بنیادی عقائد ناگزیر ہیں۔ اگر مستشرق بھی ان عقائد کا حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا اسلام میں تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبوی اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا۔ یہ اور اس طرح کی چند اور باتیں ہیں، جو مستشرقین میں عام ہیں، اور گولڈ زیہر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈ زیہر سے ہوئی ہیں، وہ علمی غلطیاں ہیں یا تعبیر و بیان کی فروگذاشتیں ہیں، لیکن یہ غلطیاں نہ چنداں تعجب انگیز ہیں اور نہ ان سے گولڈ زیہر کے بلند مرتبہ و مقام پر حرف آتا ہے، جو انھیں علم و تحقیق کی بارگاہ معلی میں بجا طور پر حاصل ہے، کیونکہ دنیا میں کسی علم و فن کا کوئی بڑا سے بڑا محقق اور دیدہ ور عالم بھی ایسا نہیں ہے، جس سے غلطیاں نہ ہوئی ہوں اور جن کی نشان دہی خود اس کی زندگی میں یا اس کے بعد نہ کی گئی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی ارتقاپذیر ہے، اور اسکی نمو پذیری اور ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی

معلومات اور ذرائع و وسائل معلومات میں بھی اضافہ اور تنوع پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں تک گولڈزیہر کی مستشرقانہ غلطیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق ہے مسلمان تو مسلمان، زمانہ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور گولڈزیہر کی طرف سے ان کی معذرت کی ہے، چنانچہ گولڈزیہر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا کے حالیہ انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۸۱ء پر پروفیسر برنارڈ لیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس کتاب سے بوجوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گولڈزیہر کا زمانہ سیاسی اور عقلی حیثیت سے کس درجہ مختلف تھا، ہمارے زمانہ میں جو مغربی مصنفین اسلام پر یا کسی اور ایشیائی و افریقی موضوع پر کتابیں لکھ رہے ہیں، اُن کے برعکس گولڈزیہر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لیے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین کو ہی بناتے تھے، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈزیہر بھی قرآن کو پیغمبر اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈزیہر نے بھی قرآن و حدیث میں عہد جاہلیت کے اور بعض اور اجنبی اثرات پر بحث کی ہے، یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈزیہر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اب سے ایک سو برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی، لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لئے آزردگی کا سبب ہو۔"

پروفیسر برنارڈ لیوس نے سطور بالا میں گولڈزیہر کی مستشرقانہ غلطیوں کی ہی نشان دہی

نہیں کی ہے بلکہ موصوف کی علمی فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:"

"محاضرات اسلام، یعنی گولڈزیہر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، بے شبہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث میں، اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات و تشریحات کے معاملہ میں گولڈزیہر کی تحقیقات کو ان نئی معلومات اور دلائل کی روشنی میں ردو بدل کیا جا سکتا ہے جو گولڈزیہر کے بعد سے اب تک حاصل ہو چکی ہیں، اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے،

لیکن ان تمام غلطیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود اس زمانہ میں اسلامیات پر لکھنے والے مغربی مصنفین کے درمیان گولڈزیہر کا انفرادی وصف اور امتیاز کیا ہے؟ پروفیسر برنارڈ لیوس نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "ہم نے اوپر جن فروگذاشتوں کا ذکر کیا ہے، ان سے قطع نظر گولڈزیہر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہمدردی کا جا بجا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہے، اگر ایک طرف گولڈزیہر میں ہمارے زمانہ کے مصنفین کی محتاط روش کی کمی ہے تو دوسری طرف اس تنقیص و تہجین کی روش سے جس کا اظہار اس عہد کے یورپین مصنفین مسلمانوں اور ان کے مذہب، تہذیب و تمدن اور ان کی مقدس کتابوں کی نسبت کرتے تھے، گولڈزیہر کا قلم اس سے بالکل آزاد اور مبرا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت اہم اور غیر معمولی بات ہے، اگرچہ گولڈزیہر اس عہد کی پیداوار ہے جس میں تبلیغ عیسائیت کا بڑا چرچا تھا، لیکن اس کے باوجود گولڈزیہر کی تحریروں میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ گولڈزیہر کے معاصرین یا ان کے پیشرو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان میں ردو بدل کر کے اسلام پر اعتراضات کئے تھے، گولڈزیہر نے ان لوگوں کی پردہ دری کر کے اسلام کی حقانیت اور اصلیت اور

انکے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں گولڈزیہر عیسائیت کے ان علما کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں تو اپنی یک طرفہ عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لیے معیار تنقید بہت سخت کر لیتے ہیں۔

سطور بالا میں پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈزیہر کے اسلام سے متعلق علمی اور تحقیقی کارناموں کا بالغ نظری سے جو تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بالکل صحیح، درست اور معروضی ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ عرب علمائے اسلام کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے چنانچہ گولڈزیہر کی دو نہایت اہم کتابوں کا عربی ترجمہ جو ہماری نظر سے گذرا ہے، ہم ان کا تعارف کراتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ علمائے عرب گولڈزیہر کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے کس درجہ قدردان تھے، اور انھوں نے کس طرح ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

(۱) ایک ضخیم کتاب جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے مختلف مناہج اور اسالیب سے بحث کی گئی تھی، اس کا عربی ترجمہ "مذاہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار نے کیا ہے، جو چار سو کے قریب صفحات پر پھیلا ہوا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع ہو کر ارباب علم و ادب میں بہت مقبول ہوا، اس ترجمہ کے پیش لفظ میں فاضل مترجم لکھتے ہیں" کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی" منہج اور اسلوب بحث اور قرآن مجید کے درس و مطالعہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد، منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کارنامہ ہے۔" اس حیثیت سے یہ کتاب علمی بحث و نظر اور قرآن مجید کی تفاسیر میں جو تنوع ہے، اس کے مطالعہ کے لیے نئے میدان مہیا کرتی ہے، کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اس طرح برملا اعتراف کرنے کے بعد فاضل مترجم لکھتے ہیں، گولڈزیہر نے اس کتاب میں تمام مذاہبِ تفسیر کا استیعاب

واستقصا نہیں کیا، علاوہ ازیں بعض دینی عواطف وجذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح مصنف سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، اور پھر کتاب اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، جن پر ہم نے اپنے حواشی میں تنبیہ کردی ہے، لیکن گولڈزیہر کو بحیثیت ایک عالم اور محقق کے جو مرتبہ بلند حاصل ہے ان چیزوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

(۲) دوسری اہم کتاب جس کا عربی ترجمہ بڑے اہتمام اور کاوش سے کیا گیا ہے، وہ یہی ہے، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، اس ترجمہ کا نام ہے، "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام، تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی"۔ اس کا ترجمہ جو حواشی کے ساتھ، ۴۰۰ صفحات پر ہے، مصر کے تین افاضل علما، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر، اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے مل جلکر کیا ہے، اس ترجمہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مستشرقین پر ایک عام گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یورپ کے جن علما نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے اس لئے وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، لیکن ان کے برخلاف ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق و تدقیق کے بعد جو بات حق نظر آئی اسے برملا کہا، اس کے بعد طبقۂ ثانیہ کے چند نامور مستشرقین اور ان کے خاص خاص کارناموں کا ذکر کیا ہے، اور پھر پروفیسر گولڈزیہر کو بھی اس طبقہ میں شمار کیا ہے، پھر گولڈزیہر کی کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کراتے ہیں،" یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدہ اور شریعت کا نشو و نما اور عہد بعہد اس کا ارتقا، زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی تحریکات، اور ان کے اسباب و علل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں انھیں مراجع سے

کام لیا ہے جو اسلام کے معتبر مراجع ہیں، اور ان مراجع سے استفادہ میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت اسکی معاون اور مددگار رہی ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں اسکے وجوہ متعدد ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی اور اصول کی اصل روح تک پہونچنے سے قاصر رہا۔

اس بنا پر فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت اور کاوش سے گولڈزیہر کی اس اہم کتاب کو عربی جامہ پہنایا اور دوسری جانب اس کتاب پر محققانہ حواشی لکھ کر مصنف کی متنوع غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشان دہی کر کے ان کی تصحیح بھی کی،

پروفیسر اربیری نے اپنی کتاب (Portraits of Persian Poets) کے مقدمہ میں کہا ہے کہ یورپ میں اسلام پر لکھنے والوں کے تین دور ہیں (۱) پہلا دور مشنری کا ہے یہ لوگ لکھتے ہی تھے اسلام کو رسوا اور بدنام کرنے کی غرض سے (۲) دوسرا دور استعمار کا ہے، اس دور میں مستشرقین جو کچھ لکھتے تھے مثلاً براؤن، نکلسن اور ڈینی سن راس، وہ علمی ذوق تحقیق اور کاوش سے لکھتے تھے لیکن استعماری طاقتیں ان سے یہ فائدہ اٹھاتی تھیں کہ ان کی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہب تہذیب و تمدن اور انکی تاریخ سے واقفیت ہوتی تھی، چنانچہ اس عہد کے مستشرقین برطانوی گورنمنٹ کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ سے بھی بحیثیت مشیر کار کے تعلق رکھتے تھے (۳) اس کے بعد جب استعمار کا دور ختم ہو گیا تو اب مستشرقین خالص علمی ذوق اور اسلامیات سے طبعی دلچسپی کی بنا پر لکھنے لگے، جہاں تک مشنریز کے کام کا تعلق ہے اسکی سخت مذمت خود پروفیسر اربیری نے کی ہے اور مسلمانوں سے اسکی معافی مانگی ہے۔

ہمارے نزدیک پروفیسر اربیری کی یہ تقسیم بالکل صحیح ہے نمبر ۲ اور ۳ کے ماتحت جو مستشرقین آتے ہیں مسلمانوں کو انکے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر کرنی چاہیئے اور جو روش علمائے عرب نے پروفیسر گولڈزیہر کی نسبت اختیار کی ہے وہی روش ہمیں گولڈزیہر جیسے دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہیئے۔

سرسیّد کے خطوط ـــــ ایک مطالعہ

جناب حامد مسعود صاحب لکچرر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

لندن میں ان کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان ہندوستانی افسروں کے حق رخصت مع تنخواہ کے لئے آواز بلند کریں، جو ولایت آنا چاہتے تھے، ۹ جولائی ۱۸۶۹ء کو وہ اپنے خط میں تذکرہ کرتے ہیں:-

"میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے، کہ ہندوستانی افسروں کو جو ولایت آنا چاہیں، اُن کو رخصت پوری تنخواہ پر ملنی چاہیئے، اکثر ممبران انڈیا کونسل کان بھی میری فریاد پر رکھتے ہیں چنانچہ میں نے اپنی درخواست پیش کی ہے نقل اس کی آپ کے ملاحظہ کے لئے روانہ کرتا ہوں، اگر یہ ہو گیا تو بلاشبہ آپ کو رخصت پوری تنخواہ پر مل سکے گی" (خطوط سرسید ص ۳۰-۳۱)

سرسید کے قیام انگلستان کے دوران ۱۸۶۹ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ میں گورنر جنرل آف انڈیا کے اختیارات کی توسیع کے لئے بل پیش کیا گیا تو وہ محسن الملک کو اپنی بے لاگ رائے سے آگاہ کرتے ہیں. جو ان کے سیاسی شعور کی آئینہ دار ہے،

"یہاں کے اکثر امراء اور ممبران پارلیمنٹ ہندوستان کے خیر خواہ ہیں، مگر چونکہ حالات سے بخوبی واقف نہیں ہیں، اس لئے بعضے تو کچھ جانتے ہیں، اور بعضوں کی رائے نہایت غلط ہوتی ہے، حال کی پارلیمنٹ میں جو بل متضمن مزید اقتدار گورنر جنرل ہندوستان

پاس ہوا ہے، درحقیقت ممبران پارلیمنٹ نے نہایت نیک نیتی سے اور ہندوستان کا فائدہ سمجھ کر پاس کیا ہے، مگر ایسی غلط رائے کی ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا، اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے ہے، اگر انگلستان میں یہ بل پاس ہوتا تو سب رعیت اس کی منسوخی کی درخواست کرتی۔[۵۱]

ایک ہندوستانی نووارد کو لندن میں جو حیرتناک نظارے دیکھنے میں آتے ہیں ان میں ایک انڈیا آفس کا کتبخانہ بھی ہے جہاں اس کے علمی ذوق کی سیرابی کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم ہیں، غدر کی لوٹ مار میں ہندوستان کے اسلامی کتبخانے برباد ہو چکے تھے، جس کی وجہ سے سرسید کو اپنی ایک اہم تصنیف تیاری میں مطلوبہ کتابوں کے فراہم نہ ہونے کے باعث ملتوی کرنی پڑی، انڈیا آفس کے کتبخانے کو دیکھ کر انھیں اپنی علمی طلب پوری ہونے کے آثار دکھائی دیتے ہیں:-

"کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا، ہوش جاتے رہے، کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کا شہر ہے، مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی جو چاہوں اور نقل کی سب اجازت ہو گئی، ابھی کتب خانہ برٹش میوزیم نہیں دیکھا ہے، سنا ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے"[۵۲]

اگلے خط میں وہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کو ایک بہت بڑے جنگل سے تعبیر کرتے ہیں۔

سرسید نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب و تمدن اور طرزِ فکر کی اہمیت کو جس طرح باور کرایا ہے، اس کا جائزہ ہم اوپر لے چکے ہیں، انگلستان کی ترقی اور شائستگی کے نمونوں کی یہ تعریف و توصیف ہمیں صرف ایک دائرے میں محسوس ہوتی ہے لیکن دوسرے دائرے میں ہم مکتوب نگار کی اس شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں، جو مذہب اسلام کی خدمت[۵۳] کو اپنی زندگی کا حاصل قرار دیتی ہے، غدر کے بعد عیسائی مشنری وسیع پیمانے پر اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام کر رہے تھے جس

---

۵۱ خطوط سرسید ص ۳۰-۳۱ ۵۲ ایضاً ۵۳ انیسویں صدی کے مسلمان شرفا کے مذہبی احوال کو

میں اسلام پر اعتراضات اور پیغمبر اسلام پر نکتہ چینی بھی شامل تھی، حکمراں طبقہ کی بالواسطہ ہمدردی اور اعانت کی وجہ سے عیسائی پادریوں کو خود بخود سہولتیں مہیا ہو گئی تھیں، تاہم مسلمانوں میں ان کی اسلام دشمنی کے جذبے کے خلاف مدافعت کی قوت پیدا ہوئی، علماء نے ان کی الزام تراشی کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں، اور مناظروں کے ذریعہ انھیں لاجواب کیا، جس سے عام مسلمانوں پر اچھا اثر پڑا، سرسید کے مذہبی جذبات آنے والے خطرات کو محسوس کر کے ان کے توڑ کی فکر میں تھے، اسی زمانے میں لائف آف محمد کی چار جلدیں چھپ کر آ گئیں، جو مشہور عیسائی مبلغ ڈاکٹر فنڈر کے اصرار پر سر ولیم میور نے لکھی تھیں، میور کی شخصیت معمولی نہیں تھی، وہ صوبہ متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر تھے، اس کے ساتھ ساتھ عربی کے عالم بھی تھے، چنانچہ انھوں نے مشنریوں کے طریقۂ کار کے برخلاف عالمانہ سطح پر پیغمبر اسلام کے اخلاق و تعلیمات پر اعتراضات کئے تھے، اس تصنیف کا اثر عیسائی مبلغوں اور سرسید کی مذہبی حمیت پر کیا ہوا، اس کی تفصیل ہم حیات جاوید کے اوراق میں پاتے ہیں، کہ ادھر تو عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس کتاب سے اسلام کو شدید ضرب پہنچی ہے، دوسری طرف سرسید کی بے چینی اور اضطراب کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کتاب کا

(بقیہ حاشیہ ص ۹۸) پیشِ نظر رکھئے، جہاں مذہب زندگی کی خاص قدر کی حیثیت رکھتا تھا، سرسید کا بچپن دلی کے دو مشہور خانوادوں کی بزرگ شخصیتوں کے درمیان گذرا، جو اسلام کی سچی تصویر مانی جاتی تھیں، مذہبی روشن خیالی انھوں نے اپنی مادر مہربان سے سیکھی، جو اوہام پرستی سے آزاد تھیں، سرسید نے تذکرہ کیا ہے، کہ آگے چل کر میں نے اپنی تحقیق و تفتیش سے اسلام کے بارے میں جو خیال قائم کئے، وہ میری والدہ کے خیال سے زیادہ مختلف نہیں تھے، بچپن میں سرسید نے مروجہ علوم کے اکتساب میں پوری توجہ صرف نہیں کی، لیکن ملازمت میں آنے کے بعد دلی کے دوران قیام انھوں نے اپنا زیادہ تر وقت مذہبی علوم کی استعداد بڑھانے میں صرف کیا، چنانچہ وہ عیسائی مشنریوں کے منظم حملوں کے

ذکر کر کے کہتے تھے، کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں ہے، انھوں نے ہندوستان میں اس کے جواب کی تیاری شروع کی، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دلی کے کتبخانوں کے برباد ہونے کی وجہ سے مطلوبہ کتابیں دستیاب نہیں ہوسکیں تو انھیں ولایت جانے کا خیال پیدا ہوا، دو ایک سال کے بعد انگلستان جانے کے اسباب پیدا ہو گئے، ان کے بعض دوستوں نے سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے سے باز رکھنا چاہا لیکن انھوں نے اُن کا کہنا نہیں مانا، اور ولایت پہونچتے ہی انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں سے کتابیں اور ضروری معلومات حاصل کیں، سیرت کی عربی کتابیں مصر، فرانس اور جرمنی سے منگوائیں اور لیٹن اور انگریزی کی نایاب کتابیں لندن کے بازار سے گراں قیمت پر خریدیں، اپنے دوست نواب محسن الملک کو متواتر کئی خطوط میں ان مشکلات کی داستان سناتے ہیں، جو انھیں خطبات احمدیہ کے لکھنے کے دوران برداشت کرنی پڑیں،

"ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے، ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرتؐ کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے مجھے جلا دیا، اور اُن کی ناانصافیوں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا، اور مصمم ارادہ کرلیا کہ آنحضرتؐ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام

(بقیہ حاشیہ ص ۹۹) نتائج کو قبل از وقت محسوس کر رہے تھے، جن کی پوری کوشش یہ تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت پر حملے کرکے نئی تعلیم یافتہ نوجوان نسل کو ان کے مذہب سے برگشتہ کردیا جائے، اور وہ اسے عقلیت، سائنس، تہذیب اور شائستگی کے منافی سمجھنے لگیں، سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد اسی قسم کی ایک کوشش تھی، سرسید نے تحقیق و تفتیش کے ساتھ بارہ خطبات پر مشتمل جیسترالزامات کا مدلل جواب لکھا جو کتابی صورت میں خطبات احمدیہ کے نام سے انگلستان میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی،

روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا، حاضر کرو، "مارا ہمیں تمغہ شہنشاہی بس است" یہاں نے فرانس اور جرمنی اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کردیں چھپیات روانہ ہوگئیں، سیر شامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خریدلیں، ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے، تین مقدمات لکھنے شروع کردیئے"[۵۶]

حب رسول کا والہانہ جذبہ عمل میں ڈھلتا ہے، اور مکتوب نگار کی پرجوش شخصیت ایک انگریز مصنف (سر ولیم میور) کے رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ سے متعلق تعصبات اور ناانصافیوں کا محققانہ جواب دینے کی ہر ممکن سبیل نکالتی ہے، اگر تمام روپیہ ختم ہو جائے، اور میں بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے "عشق مصطفےٰ" سے بریاں دل کسی قسم کی مزاحمت کو خاطر میں نہیں لاسکتا، تحقیقی کام محقق سے جس استغراق کا تقاضا کرتا ہے، وہی دھن مکتوب نگار پر طاری نظر آتی ہے، اس کے لکھنے میں جو ولولہ اور جوش سرسید کے دل میں تھا، اور جو مالی مشکلات اس دوران ان کو پیش آئی تھیں، ان کا اندازہ ان تحریروں سے ہوتا ہے،

"میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب ادھر فکر جواب اعتراضات، ادھر فکر تنقیح و تصحیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہوگیا ہے، ادھر جب حساب دیکھتا ہوں، تو جان نکل جاتی ہے، کہ ابھی لکھوانا اور چھپوانا تو شروع

[۵۶] خطوط سرسید ص ۳۰۸،

کردیا، روپیہ کہاں سے آئے گا مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے، کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ، مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچاویں گے، اگر میری کتاب تیار ہو گئی جس میں دس باب ہیں، تو میں لندن میں آنا دس حج کی برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔[۵۱]

ذوق و شوق کے باوجود دقتیں مزاحم ہوتی ہیں، تو ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:-

"میور صاحب کی کتاب کے جواب کا سامان نہیں ہو سکا، ایک انگریزی خواں اور ایک طالب علم جو مقامات نشان دادہ کو کتب میں تلاش و نقل کر سکتا، میرے ساتھ ہوتے، تو میں ایک برس میں اس کا جواب لکھ لاتا، اب نہیں ہو سکتا، مگر میں اس کے مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ رہا ہوں، اور اسی کا نام مواعظ احمدیہ رکھا ہے[۵۲] پہلا وعظ تیار ہو گیا، اس کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں معتبر و غیر معتبر اور صحیح و غلط روایتیں شامل ہیں، اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انکی ہر ایک بات کو اصلی مذہب سمجھا جائے، پس جن لوگوں نے ہماری کتابوں کی روایتوں کو چن کر ہمارے مذہب پر یا ہمارے پیغمبر خدا صلعم کی نسبت الزام و اتہام دیا ہے وہ حماقت ہے، کیونکہ اول یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ روایت صحیح و معتبر بھی ہے یا نہیں"[۵۳]

اس کتاب کی تیاری میں وہ محنت شاقہ اور مالی مشکلات سے گذر رہے تھے اور دور دراز فاصلے کے باوجود مکتوب الیہ سے بڑے اعتماد کے ساتھ پوری امداد طلب کرتے ہیں اول انتخاب و تحریر مقامات کتب و تحقیق بعض مسائل کی" اور دوسرے مالی امداد کے لئے موثر ذرائع

---

[۵۱] خطوط سرسید ص ۴۲ ۔ [۵۲] خطبات احمدیہ کی طرف اشارہ ہے، پہلے اس کا نام مواعظ احمدیہ تجویز ہوا تھا، [۵۳] خطوط سرسید ص ۳۶،

اختیار کرنے میں ان کو اپنے مخاطب کی صلاحیت اور مستعدی کا اعتراف ہے، اور ان سب سے بڑھ کر وہ دلی تعلق اور ذہنی قربت کا احساس ہے، جس کی بدولت انگلستان اور ہندوستان کے درمیان فاصلہ سمٹ رہا ہے، چنانچہ وہ اپنی ضرورت بیان کرتے ہیں:-

"کم سے کم دو ڈھائی ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ آپ وہاں احباب مخلصین سے چندہ کیجیے"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں کتاب کی تیاری کے ضمن میں محسن الملک کو مشورہ دیتے ہیں کہ سو سو روپیہ احباب مخلصین سے چندہ لیا جائے، بخچہ تیس آدمی ہونے چاہئیں، اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے ہم قوموں کی تنگ دلی اور تنگ نظری کا خیال آتا ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے:

"مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاو، مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچادیں گے، اگر میری کتاب تیار ہو گئی جس میں دس باب ہیں، تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کے سمجھوں گا، خدا قبول کرے"[۵۰] (آمین)

عصری زندگی کی دانش و بینش کے مطابق مکتوب نگار نے اسلامی عقائد کی توجیہ عقلیت کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ ایک ہندوستانی مسلمان کی ایسی کامیاب کوشش ہے کہ جس پر اسے بجا طور پر اعتماد ہے،

"اب میرا حال سنئے، مواعظ احمدیہ لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں، جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے، آنحضرت صلعم کے بارہ برس

---

[۵۰] خطوط سرسید ص ۴۲،

کی عمر تک کا حال لکھ چکا ادر سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، مگر ایسا جواب نہیں ہے جیسا کہ تمھارے یہاں کو ملاں مشرکین فی صفتہ النبوۃ دیتے ہیں نہایت محققانہ جواب ہیں[51] اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو، وہ کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا نام، ورنہ میرا نام ہی نہیں، اپنی تحریر کو آپ ہی دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں کہ بیان سے باہر ہے[52]"

سرسید کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے، جس کی بنا پر ان کے ہم قوم انھیں کافر کا خطاب عطا کریں گے، لیکن انھیں اپنے خیالات پر اعتماد ہے، چنانچہ وہ یہ اعلان ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کی صحیح اسپرٹ کو سمجھنے کے لئے نظر میں کشادگی ضروری ہے، اور یہ نظر حریت فکر کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ پھر محسن الملک کے سامنے کھلے طور پر اپنا موقف بیان کرتے ہیں:۔

"بھائی جان سنو! اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنی کمنونات ضمیر کو مخفی نہ رکھوں، میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے، اور خاص

[51] خطبات احمدیہ ہندوستان سے باہر اسلامی دنیا میں کس طرح سر آنکھوں پر لئے گئے، وہ مکتوب نگار کی شب و روز محنت کا صلہ بن جاتا ہے، جسے سرسید ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، "میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم قیجر نے پڑھی، جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے، وہ الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھ کو لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے، اس کی لذت میں جانتا ہوں، [52] خطوط سرسید ص ۴۶

اس روشنی سے جو قرآن اور احادیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے تلاش نہ کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائیگا، اسی خیر خواہی نے مجھے برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا[53]، ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کیلئے اور بہشت میں داخل ہونے کیلئے ائمہ کبار تو درکنار مولوی حبو کی بھی تقلید کافی ہے۔[54]"

سرسید اپنے اس خیال پر بار بار زور دیتے ہیں کہ حقیقت کی دریافت تقلید کے بجائے تحقیق کے ذریعہ ممکن ہے اسطرح وہ آزادانہ طور سے سوچنے اور سائنسی نقطۂ نظر کو اپنانے کی وکالت کرتے ہیں، انکا یہ تحقیقی ذوق روایت شکنی کا نتیجہ تھی آگے چل کر اسی رجحان سے وہ انقلابی خیالات پیدا ہوئے جنھوں نے افراد قوم کو آزادی رائے کا عادی بنایا، محسن الملک کے نام ایک خط میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں،

"آپ خفا ہوں یا نہ ہوں میں سچ اپنے دل کا حال کہتا ہوں کہ اگر خدا مجھے ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا، فرض کرو کہ تقلید چھوڑنے میں میں کسی مسئلہ یا عقیدے میں غلطی میں پڑوں چنداں نقصان نہ ہوگا، مسلمان تو رہونگا، کیا آپکے نزدیک امام اعظم علیہ الرحمہ نے کسی مسئلہ میں غلطی نہیں کی، قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ مسلمان تیلی جولاہوں، ناخواندہ یا کم علم مسلمانوں کو سزا دینے لگے گا تو بندہ سامنے ہو کر عرض کریگا کہ جناب باری انصاف فرمائیے ان بیچاروں کا کیا قصور ہے یہ تو حضور خود بدولت ہی کی تقصیر معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ایسا مذہب دیا تھا کہ جسکے حل کرنے اور سمجھنے میں جناب قبلہ و کعبہ مولوی سید مہدی علی صاحب

[53] تقلید سے گریز کرکے عقل پسندی کا رجحان انیسویں صدی کے یورپ کی خاص آواز تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ حقیقت تک رسائی اور اسکے ادراک کا سب سے بڑا ذریعہ اور معیار عقل ہے، یورپ کے مفکرین اور ادیبوں کے انہماک اور دلچسپی کی بدولت یہ کچھ عرصہ کیلئے یورپ کے ذہن و فکر کی سب سے بڑی کلید بن گئی، اور جب یہ سوغات یورپ سے ہندوستان آئی تو یہاں بھی اسکا غیر معمولی اثر ہوا اور سرسید اور انکے رفقاء نے خاص طور سے اسکو اپنایا (ماخوذ از سرسید اور ان کے نامور رفقاء ڈاکٹر سید عبداللہ) [54] خطوط سرسید ص ۵۶

جگر گوشۂ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسّلام بھی اپنے تئیں لائق نہیں سمجھتے تھے۔[1]

اس اثنا میں جب مکتوب الیہ کا پیغام پہونچتا ہے کہ وہ عقل اور نیچر کی ہمہ گیر اولیت کے نظریات کے حامی ہیں تو اپنی اس بحث کو ایک خوش آیند مستقبل کی امید میں ان الفاظ میں تمام کرتے ہیں

جناب قبلہ وکعبۂ من، جب آپ نے یہ قبول کر لیا کہ اسلام و عقل و نیچر میں مخالفت نہیں تو کام پورا ہو گیا۔ اب ہم آپ کی بہادری دیکھیں گے کہ کیونکر تقلید کو تھامے رہتے ہو اور اس کو لازم ٹھہراتے ہو۔[2]

زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوم کی صحیح تعلیم و تربیت کا خیال مکتوب نگار کے ذہن میں موجود ہے لیکن انگریزی تعلیم کے فوائد اہل وطن پر ابتک واضح نہیں ہو سکے جس پر اسے جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ محسن الملک جب مدرسۂ عربی مقرر کردہ جناب محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے قیام کے لیے اخبار سوسائٹی میں اپیل نکالتے ہیں اور وہ سرسید کی نظر سے انگلستان میں گذرتی ہے تو وہ اسے تباہی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ انھیں رہ رہ کر اس چیز کا غم ہے کہ قوم اس نزاکت کو باور کرنے سے ابتک گریز کر رہی ہے کہ تعلیم و تربیت کے صرف پرانے نظام کو برقرار رکھنے اور اس پر اکتفا کرنے سے معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ یہ نظام تربیت انکی زندگی کے موجودہ مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔

"ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے، افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی! کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب

---

[1] خطوط سرسید ص ۷۰، [2] ایضاً ص ۷۰

ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے، اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے، اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔"[1]

غم اور مایوسی کے ان الفاظ کے پس پردہ وہی خواہش سر اٹھاتی محسوس ہوتی ہے کہ قوم کو زمانے کی تبدیلیوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے انداز نظر کو بدلنا ناگزیر ہے۔ سرسید علوم عربیہ اور مذہبی تعلیم کے مخالف نہیں تھے، یہ تنقید قدیم طرز کے عربی مدارس پر تھی۔ چنانچہ آگے چل کر وہ ۱۸۸۹ء میں عماد الملک کو لکھتے ہیں۔

"اسی کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جا رہا ہے کسی طرح قائم رہے، اگر عربی و فارسی ہم میں سے معدوم ہو جاوے گی، تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جاوے گی۔[2]

ہندو قوم میں اپنی زبان اور کلچر کے تحفظ کا احساس پنپ رہا تھا۔ جو نئے عہد کی بیداری کا اعلان تھا لیکن ان حالات میں دقت اسوقت پیش آتی ہے جب ایک زبان کا مفاد دوسری زبانوں کے مفادات سے ٹکرانے لگے۔ ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء کو سرسید محسن الملک کو انگلستان سے ایک خط میں حال میں رونما ہونے والے ایک واقعہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جو اردو کے رسم الخط سے متعلق ہے۔

ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھکو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندوؤں کے دلوں میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو کے خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سینٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو کے ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی ترکیب ہے کہ ہندو

---

[1] خطوط سرسید ص ۷۰، [2] سرسید احمد خان خلیق احمد نظامی سالار جنگ کے نام سرسید کا خط ص ۸۶

مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور
نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علحدہ اور مسلمان علحدہ ہو جائیں گے۔[1]

آگے چل کر سرسید جو کچھ خط میں تحریر کرتے ہیں وہ ان کے مافی الضمیر کی وضاحت کرتا ہے۔ اول تو یہ کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی بھلائی کے خواہاں ہیں۔ دوسرے انھیں اپنے ہم مذہبوں کی ذہنی پستی اور بے حسی کا بھی پورا اندازہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں معاشی اور سماجی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں۔ حسد، کینہ، جھوٹی شیخی اور مفلسی بربادی کے تمام سامان انکے سروں پر مسلط ہیں، چنانچہ وہ اپنی بھلائی کے لئے کوئی اقدام کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے اپنے مفاد کے تحفظ کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ قومی دردمندی کا یہ جذبہ مکتوب نگار کو کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنی قوم کی ہر کمزوری کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، اور کمزوریوں کو چن چن کر ان کی آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ خود وہ بھی گالیوں کا نشانہ بنتا ہے لیکن اصلاح کی خواہش اسے قوم کو بیداری کا پیغام دینے پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ اگلے خط میں وہ مکتوب الیہ کے اس احتجاج پر کہ ایک ہم وطن (بابو شیو پرشاد) نے مسلمانوں کے بارے میں سخت کلمات ادا کیے ہیں۔ سرسید بظاہر اثر نہیں لیتے۔ بلکہ اسے اپنی قوم کی کمزوریوں کا نتیجہ گردانتے ہیں البتہ صورت حال کے مطابق وہ اصلاح کا ایک نیا نسخہ تجویز کر کے مکتوب الیہ کو متحیر اور مسرور بناتے ہیں۔ یہ ہے تہذیب الاخلاق جاری کرنے کا عزم جو ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو پہلی بار شائع ہوا اور انگلستان سے حاصل کیے ہوئے تجربوں یعنی شائستگی اور تہذیب اور تعلیم و تربیت کے قانون کو اپنے معاشرے میں عام کرنے کا ایک ارگن ہاتھ آیا۔ محسن الملک کو اطلاع دیتے ہیں۔

میرے خیال میں آپ بابو شیو پرشاد صاحب کا جواب جس کے چھاپنے سے راجہ

[1] خطوط سرسید ص ۶۶۔

جے کشن داس بہادر نے انکار کیا کسی اخبار میں چھپوا دیجیے۔ اس باب میں میں نے بہت کچھ خیال کیا ہے اور آپ سے بہت کچھ کہنا اور اصلاح کرنی ہے۔ اس کے بعد جیسا مناسب ہوگا کیا جاوے گا، ایک اخبار خاص مسلمانوں کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے۔ اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی اور اردو میں محمڈن سوشل رفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے، اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہونچنے تک پہونچ جاویں گی، جو خرچہ ماہواری اجرا اس اخبار کا ۱۰۰ سو روپیہ ہوگا۔ ہم ۲۰ بیس دوست پانچ، پانچ روپیہ مہینے کر کر دیں گے۔ اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بہ قیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اسکے کہ خاص مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل لکھنے والے ہونگے اور کچھ نہیں ہونے کا اس میں میں اور آپ دو شخص آرٹیکل لکھنے والے ہونگے اور اگر صلاح ہوئی تو منشی ذکاءاللہ صاحب اور منشی نجم الدین صاحب کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے۔"[1]

اسلام کی محبت اور حمایت میں سرسید کو جو جوش اور جذبہ انگلستان میں خطبات احمدیہ کی ترتیب و تنقیح اور تصحیح کی صبر آزما محنت سے گذار تا ہے اور جس کے اختتام پر انکے اندر مذہبی تحقیق کا ذوقی پروان چڑھتا ہے۔ اسی قسم کی ذہنی اور روحانی مسرت کا احساس انھیں مشہور عالم پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کی شاعت پر ہوتا ہے وہ اس کتاب کو کسقدر اہمیت دیتے ہیں۔ اور قوم کی زیر تعلیم نئی نسل کیلئے اس کا مطالعہ کیوں ضروری قرار دیتے ہیں، اسکی بابت ۹ مئی ۱۸۹۶ء کے اس خط میں دیکھئے جو مولوی نیاز محمد خاں وکیل پنجاب کے نام ہے۔

[1] خطوط سرسید

"آپ کو معلوم ہوگا کہ مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے پروفیسر نے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام پریچنگ آف اسلام ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ "اسلام بزور شمشیر نہیں شائع ہوا ہے، بلکہ وعظ ونصیحت سے زیادہ تر شائع ہوا ہے" عزیزی محمد عنایت اللہ بی اے نے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، اور میں خود اس ترجمے کا اصل کتاب سے مقابلہ کرتا ہوں۔ اور اس سبب سے مجھے اس کتاب پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا ہے، اور میں اس کتاب کو مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید سمجھتا ہوں، میری اور میرے چند دوستوں کی یہ رائے ہے کہ مسلمان انگریزی خوان طالب علم جو گورنمنٹ کالجوں اور مشنری کالجوں میں پڑھتے ہیں، انکو یہ انگریزی کتاب بلا قیمت دی جاوے۔ یعنی مسلمان ہر ایک مقام کے چند کاپیاں اس کتاب کی خریدیں اور مسلمان طالب علموں کو جو کالج کلاسوں میں پڑھتے ہوں ان کو بلا قیمت تقسیم کردیں، غرض یہ ہے کہ اس کتاب کا مسلمان انگریزی خواں طالب علموں میں شائع ہونا نہایت مفید ہے، اور بہت سے تاریخی حالات متعلق اسلام اور اشاعت اسلام اور نیز بہت سے مفید امور انکو معلوم ہونگے۔" سلہ

ہم متعدد خطوط میں دیکھ چکے ہیں کہ مذہبی امور و مسائل پر بحث و مباحثہ سرسید کا مرغوب موضوع ہے، لیکن صرف اسوقت تک جب ان مسائل پر گفتگو کرنے سے کسی بہتر نتیجہ تک پہونچنے کی امید ہو۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے مذہب کے خلاف پنجاب میں زبردست شورش ہو رہی تھی، سرسید اس قسم کے احتجاج اور اس سے پیدا شدہ فتنہ وفساد کو محض تضیع اوقات قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مولوی میر حسن کے نام ایک خط میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

سلہ خطوط سرسید ص ۲۳۹۔

"مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے لوگ کیوں پیچھے پڑے ہیں، اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے تو بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے، نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک رہے، اگر نہیں ہوتا اور صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے، وہ جو ہوں سو ہوں اپنے لئے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ آدمی نیک بخت اور نمازی پرہیزگار ہیں یہی امر انکی بزرگداشت کو کافی ہے جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے، ان کی کتابیں میں نے دیکھیں، وہ ایسا ہے جیسے انکا الہام۔ نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔ حکیم مولوی نور الدین احمد صاحب کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی، دینیات میں کسی کا الہام جب تک اسے شارع تسلیم نہ کر لیا جائے کسی کام کا نہیں۔" سلہ

مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں سرسید ایک وسیع نقطہ نظر اپنانے کے حق میں ہیں، جو روایت پرستی کے خلاف ایک بڑا چیلنج بن جاتا ہے، انکا یہی انداز نظر اردو ادب کے دائرے میں نئے میلانات اور رجحانات کے لئے راہیں متعین کرتا ہے، اجتماعی اور افادی اہمیت کے پیش نظر وہ ادب کے پرانے تصور کو مسترد کرتے ہیں، ان کے نزدیک ادب بیکاروں کا مشغلہ نہیں تھا، اس لئے لفظی بازیگری کے بجائے ادیب کو اس طرف توجہ دینی چاہئے کہ "جو لطف ہو وہ مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسروں کے دل میں پڑے۔ دل سے نکلے دل میں بیٹھے" اسی طرح ان کے نزدیک "فن شاعری بدجذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں"۔ چنانچہ پرانی اردو شاعری کی بڑی کمزوری ان کی نظر میں یہ تھی کہ اس میں فطرتی جذبات کی کمی تھی جب کہ اسے انسانی طبیعت اور نیچر کا قدرتی اظہار

سلہ خطوط سرسید احمد

بننا چاہیے۔ لاہور میں محمد حسین آزاد انجمن پنجاب[1] کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسہ میں نیچرل شاعری کی اہمیت کو باور کراتے ہوئے اس امر پر زور دیتے ہیں۔ کہ قدیم رنگ کو ترک کر کے ایسی نظمیں کہی جائیں جو فطرت کے مطابق ہوں۔ آزاد نے انجمن کے جلسہ میں اپنی مثنوی خواب امن سنائی تھی۔ جس کی نقل انھوں نے سرسید کی خدمت میں روانہ کی۔ اس کی رسید دیتے ہوئے سرسید شاعری کے اس جدید رجحان پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو مزید واضح کرتے ہیں!

"میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرے سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں، آپ کی مثنوی "جواب امن" پہونچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ اور حقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے، اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا۔ اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جاویں، یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں، ہم بیان کیا کر سکتے ہیں"[2]

مولانا حالی کی مشہور و معروف مسدس مد و جزر اسلام کو پہلی بار دیکھکر بھی انھوں نے شعر کے اندر صفائی، خوبی، روانی کے ساتھ ساتھ تاثیر کی بھی شرط لگائی تھی، جو دل سے نکلتی ہے،

---

[1] ۹ اپریل ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں انگریز افسران میں کرنل ہالرائڈ، مسٹر جسٹس بوئینو چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل مکلاگن، ہسٹینگ کمشنر اور بنٹ ڈپٹی کمشنر لاہور تھے، ہندوستانی ادبی شخصیتوں میں پیارے لال آشوب، مولوی سید احمد دہلوی مصنف فرہنگ آصفیہ، مولوی کریم الدین، منشی درگا پرشاد نادر اور پنڈت من پھول تھے، اس میں محمد حسین آزاد نے اپنا مشہور خطبہ جدید شاعری کی حمایت میں دیا تھا۔ [2] خطوط سرسید احمد خان ص

اور دل میں بیٹھتی ہے، اور اس لحاظ سے مسدس حالی کو اردو شاعری کی تاریخ جدید قرار دیا تھا۔

"عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہونچے، جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہو گئی تو افسوس ہوا، کہ کیوں ختم ہو گئی، اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے کہ بیان سے باہر ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہے، متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم نہیں پڑھے جا سکتے، حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے"،

حالی کی اس مسدس کی اصل قدر و قیمت مکتوب نگار کی نظر میں کیا ہے، اسی خط کے آخری حصہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

"بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہونگا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں"[1]

ان خطوط میں سرسید کی پر جوش، باہمت اور جری شخصیت عکس ریز ہے، یہ افکار خطوط غالب کے متنوع تجربات سے مختلف ہیں کہ اس میں قوم کے دکھ درد اور اقتصادی و معاشرتی زبان کا احساس پورے طور سے چھایا ہوا ہے، یہاں ہمیں مذہبی حقائق کی تفتیش اور قوم کے غلط تعصبات کو دور کرنے کی سعی نظر آتی ہے، ان خطوط میں برطانیہ کی سرزمین، اس کی تہذیب و تمدن اسکی تعلیم، صنعت و حرفت سے متعلق صدائے تحسین و آفرین بھی ملتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ہم غیر جانبداری کے ساتھ دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار اپنی بیمار قوم کی صحت یابی کیلئے

---

[1] خطوط سرسید۔ ص ۱۲۵-۱۲۶

اس کے سامنے ایک ترقی یافتہ نظام حیات کو بطور مثال پیش کرکے اسے عمل اور جد و جہد کی تلقین کرتا ہے، اس کے مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی افکار کی قوت کے ساتھ مخالفت ہوئی، لیکن اس کے باوجود ان خیالات کے پس پردہ جو اسپرٹ کار فرما تھی۔ اس کی صداقت کو تسلیم کیا گیا۔ سرسید کے ان خطوط میں اس ان تھک جد و جہد کی ہنگامہ خیزیوں کی روداد ملتی ہے جو انھوں نے مصلح، مجدد اور قائد کی حیثیت سے جاری رکھی۔ ان کی جری اور مستعد شخصیت نے قومی بیداری کا جو منظم منصوبہ بنایا تھا اس کے لیے انھوں نے مغرب کی تہذیب و تمدن کی خوبیوں کو اپنانے کی وکالت ضرور کی تھی، لیکن وہ مذہب اسلام اور رسول اکرمؐ سے والہانہ عشق رکھتے تھے، جس کے نتیجے میں انھوں نے انگلستان کی زندگی کی رنگینیوں اور عیش و طرب سے منہ موڑ کر "خطبات احمدیہ" جیسی تصنیف اسی سرزمین فرنگ پر مکمل کی۔ اس طرح انیسویں صدی کے ربع آخر میں تحریر کیے ہوئے یہ خطوط اپنے عصر کی ذہنی تبدیلیوں اور مسلمانوں کی تحریک تعلیم کے ابتدائی مرحلہ ہائے تب و تاب نیز مذہبی امور میں مکتوب نگار کی مجددانہ رایوں اور اردو ادب اور شاعری سے متعلق ان کے مطمح نظر کو قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔

مکاتیب شبلی

مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام ان کے خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے قومی خیالات، علمی تصورات، تعلیمی نظریات، اور ادبی نکات ہیں، یہ محض خطوط ہی نہیں ہیں، بلکہ درحقیقت ہندوستان کے مسلمانوں کی تیس برس کی نہایت مستند تاریخ ہے بعض بعض خطوط تو اتنے برجستہ ہیں کہ ان کے پڑھنے میں غالب کے خطوط کا مزہ ملتا ہے، اس میں سرسید علیہ الرحمہ کے نام بھی متعدد خطوط ہیں، جو مولانا نے قسطنطنیہ سے لکھے تھے۔

قیمت :۔ ۱۴ روپیہ۔ دوم ۱۱ روپیہ — منیجر

الواح الصّنادید

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم صاحب شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

راقم الحروف نے ۱۹۵۳ء سے مشاہیر کی قبروں کے کتبے نقل کرنے شروع کئے تھے، اور اس دوران میں کئی بار یہ خیال آیا کہ انھیں قسط وار کسی علمی و ادبی مجلہ میں شائع کرا دوں لیکن جب بھی انھیں مضمون کی شکل میں ترتیب دینے کا ارادہ کیا، تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آگئی، اب اس کو مکمل کرکے رسالہ معارف کی نذر کیا جا رہا ہے،

شادماں کالونی لاہور میں سرکاری ملازموں کی رہائشی کالونی[۱] سے ملحق ایک چھوٹا سا قبرستان ہے، جو ایک بزرگ شیر شاہ ولی کے نام سے منسوب ہے، اس قبرستان کے پاس رات دن ہزاروں انسان گذر جاتے ہیں لیکن ان میں سے شاید ہی کسی کو معلوم ہوگا کہ وہاں کن ایسی ہستیاں محو خواب ابدی ہیں، جن کی زندگیاں بڑی ہنگامہ خیز گذری ہیں،

قبرستان کی شمالی دیوار کے ساتھ ہی ایک چھتری کے نیچے السنۃ الشرقیہ کے عالم بے بدل مولوی محمد شفیع، پرنسپل یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور دفن ہیں، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے :۔

---

[۱] یہ کالونی G.O.R.. III کے نام سے مشہور ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

آخری آرامگاہ

پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم و مغفور

دہر دوراں کم آورد فرزند — چو محمد شفیع دانش مند

آں بہ فضل و بہ معرفت مشہور — واں مبرا ز نخوت و غرور

خاکِ لاہور را ز و فرزۂ شرف — پدر فضل را بہینہ خلف

ادب از خامہ اش بجلوہ گری — فرد و مطلق بتازی و بدری

(از آقا بدیع الزماں فروزانفر، دانشمند شہیر ایران)

تاریخ ولادت ۱۰ر اگست ۱۸۸۳ء مطابق ۲ر شوال ۱۳۰۰ھ،

تاریخ وفات ۱۴ر مارچ ۱۹۶۳ء مطابق ۱۸ر شوال ۱۳۸۲ھ

مولوی محمد شفیع کے مزار سے جانب غرب اندازاً پچاس میٹر کے فاصلہ پر نئے ڈیزائن کی ایک خوبصورت عمارت[1] کے نیچے ڈاکٹر تصدق حسین خالد آرام فرما ہیں، موصوف آزاد شاعری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، ان کی رفیقہ حیات بیگم سلمٰی تصدق نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، موصوفہ اپنے شوہر کی قبر سے قریب ایک مسجد تعمیر کرا رہی ہیں جو ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے نام نامی سے منسوب ہے، مسجد سے ملحقہ عمارت میں عائشہ اکیڈمی اور مستقبل قریب میں زینب کے نام سے ایک علمی ادارہ اور ایک فری ہسپتال قائم ہو چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے۔

[1] یہ عمارت پانی پت میں خواجہ الطاف حسین حالی کے مقبرہ کی عمارت سے ملتی جلتی ہے،

آخری آرامگاہ

الحاج ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد

ایم اے۔ پی ایچ ڈی، بار ایٹ لا،

وطن مالوف :- بٹالہ

ولادت :- ۲ر فروری ۱۹۰۱ء (پشاور)

وفات :- ۱۳ر مارچ ۱۹۷۱ء (لاہور)

قبر کے تعویذ پر اُن کی ایک آزاد نظم شب بخیر کندہ ہے، اس نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے،

شب بخیر

تشنہ کامانِ سرود
ایک میٹھی نیند، میٹھے خواب
تم سب کے نصیب
ختم ہوتی ہے نوائے چنگ و نے
جو مجھے تھوڑا بہت کہنا تھا میں نے کہہ دیا،
شعلۂ خس دیدہ بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا،
ہاں مگر
وہ امر جوتی ۔ محبت کی ایک،
بجھ نہیں سکتی ہوائے دہر سے،
شب بخیر۔ — خالد

تعویذ کے دائیں جانب یہ عبارت کندہ ہے :-

رازہی راز ہے حیرت کدۂ بزمِ نمود　　　یہ تماشا گہہِ عالم کیا ہے

(خالد)

تعویذ کے بائیں جانب یہ عبارت منقوش ہے،

بارگاہِ قدس میں آیا ہوں بے آشامِ ذوق

خالد

تعویذ کے پائنتی یہ مصرع لکھا ہوا ہے ع

زندگی سوئی ہے آرام کی نیند

خالد

اسی قبرستان کے جنوبی سرے پر شیر شاہ ولی کے گنبد کے قریب ایک مختصر سے احاطۂ قبور میں برعظیم[1] پاک و ہند کے نامور عالم دین مولانا محمد ادریس کاندھلوی[2] محوِ خواب ابدی ہیں، مولانا کاندھلوی کے علمی پایہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے، کہ ان کے تلامذہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، سید اسعد مدنی اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے اساطینِ علم کے نام آتے ہیں،

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے

۱؎ Sub-Continet کا صحیح ترجمہ برعظیم ہے، نہ کہ برصغیر

۲؎ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے فرزند محمد میاں صدیقی نے تذکرۂ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے عنوان سے ان کے سوانح حیات شائع کر دیے ہیں،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد قال اللہ جل حکمہ وسلام علیہ (ابدا) یوم ولد و یوم یموت و یوم یبعث حیا

سنہ ۱۹۷۴ء

مرقد مبارک

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ

تاریخ وصال یکشنبہ ۸ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء

وائے عارف بود ہنگامِ سحر عالم خراب

رفت آں مہتاب دیں قبل طلوعِ آفتاب

۶۸۰ - ۵۱ - ۴۴۸ - ۶۴ - ۱۳۲ - ۱۱۵ - ۴۸۴

سنہ ۱۹۷۴ء

میانی صاحب[1] لاہور کا سب سے بڑا قبرستان ہے، اور یہ کئی خطوں میں منقسم ہے، اس کا ایک خطہ نظام شاہ کے نام کی رعایت سے احاطۂ نظام شاہ کہلاتا ہے، اس خطہ میں بڑے نامی گرامی شاعر، ادیب، صحافی اور سیاستدان مدفون ہیں، ان مشاہیر کی قبروں کو دیکھ کر ذہن معاً اس مصرع کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

احاطۂ نظام شاہ میں اقبال و رومی کے شارح اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے بانی اور ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم محوِ خواب ابدی ہیں، ان کی لوحِ مزار پر چاند تارا منقوش ہے،

۱؎ اس قبرستان کے وسط میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ اور ان کے صاحبزادوں کے استاد شیخ محمد طاہر لاہوری (م ۱۰۴۰ھ / ۱۶۳۱ء) دفن ہیں، ان ہی کی وجہ سے اس قبرستان کو شہرت ملی،

اور اس کے نیچے یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان

آرامگاہ

فیلسوف علامہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم غفرلہ اللہ

متوفی ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء مطابق ۲۰ رجب ۱۳۷۸ھ

الحکیم داخل خلد	مغفور پروردگار
۱۳۷۸ھ	۱۹۵۹ء

تعویذ کے اوپر سورۃ الفجر کی یہ آخری چار آیتیں منقوش ہیں:-

یاایتھا النفس المطمئنۃ ۔ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ۔

فادخلی فی عبادی ۔ وادخلی جنتی ۔

تعویذ کے بائیں جانب حافظ شیرازی کا یہ شعر کندہ ہے،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق	ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور دائیں جانب یہ شعر منقوش ہے،

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ	کہ زیارتگہ رندان جہاں خواہد شد

تعویذ کے پائنتی یہ عبارت درج ہے،

موت اک زندگی کا وقفہ ہے	یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

احاطۂ نظام شاہی میں لاہور کے ایک نامی گرامی مورخ جج محمد لطیف دفن ہیں، بھاٹی دروازے کے اندر ایک بازار ان کی نسبت سے بازار جج لطیف کے نام سے مشہور ہے،

موجودہ صدی کے ربع اول میں لاہور کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھاٹی دروازے کے اندر ہی رہتے تھے حکیم احمد شجاع پاشا اس علاقے کو لاہور کی چیلسی کہا کرتے تھے جج صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مزار

خان بہادر شمس العلماء سید محمد لطیف غفرلہٗ

سیشن جج پنجاب

فیلو پنجاب یونیورسٹی، ممبر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی، فیلو رائل جیوگرافیکل سوسائٹی وغیرہ

مصنف تاریخ پنجاب، تاریخ لاہور، تاریخ آگرہ، تاریخ ملتان وغیرہ

تاریخ وفات

۹ فروری ۱۹۰۲ء مطابق ۲۹ شوال ۱۳۱۹ھ یوم یک شنبہ

عاقلے گفت ز احوال ادبا من کایں بیت	بر لب آورد و در آں لحظہ کہ کار آخر شد
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد	روئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد
بہر تاریخ وصالش شنیدم کہ سروش	حیرتے خورد و بگفت آہ بہار آخر شد

(۱۳۱۹ھ)

جج صاحب کی قبر سے جانب شمال بر لب سڑک مشہور ادیب اور مزاح نگار چراغ حسن حسرت محو خواب ابدی ہیں، ان کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آرام گاہ

مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری مرحوم

تاریخ وفات ۵ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ مطابق ۲۶ جون ۱۹۵۵ء عیسوی

قطعہ

آج حسرت داغِ حسرت دے کے رخصت ہو گیا
دل میں اب روشن رہے گا رخصتِ حسرت کا داغ

بجھ گئی بزمِ صحافت میں صفِ ماتم حفیظ
گل ہوا ہے آج اک بزمِ صحافت کا چراغ

۱۹۵۵ء

(حفیظ ہوشیار پوری)

مولانا حسرت سالہا سال تک روزنامہ امروز لاہور میں سندباد جہازی کے نام سے مزاحیہ کالم لکھتے رہے، اُن کی یہ غزل تو بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا
جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت
یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا

ناکامِ تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے
یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا

امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی
وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا

غیروں سے کہا تو نے غیروں سے سنا تو نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

اسی احاطہ میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی قبر بھی موجود ہے، اس کے ارد گرد ایک چار دیواری بنی ہوئی ہے، اور ان کا مزار ایک اونچے چبوترے پر ہے، حکیم صاحب لاہور کی علمی

مجلسوں کے روحِ رواں تھے، ان کے ہمنشینوں میں آغا حشر کاشمیری، عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر جیسے ادیبوں اور صحافیوں کے نام آتے ہیں، حکیم صاحب جتنے بڑے طبیب تھے، اتنے ہی عظیم خطاط بھی تھے، پنجاب کے مشہور خطاط تاج زریں رقم نے خطِ نستعلیق میں حروف کے دائرے بنانے ان ہی سے سیکھے تھے، حکیم صاحب کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

شفاء الملک حکیم فقیر محمد مرحوم

۱۳۵۶ھ

چشتی نظامی

آسودہ ہے اس خاک میں وہ حاذقِ یکتا
تھی جس کی مسیحا نفسی آیۂ یزداں

علم و ہنر و فضل میں سرتاجِ اماثل
لطف و کرم و فیض میں سرحلقۂ اقراں

تھی جس کی شفا زندگی کا پیغام
تھی جس کی دوا موجۂ سرچشمۂ حیواں

وہ بوعلیِ ہند کہ اعجاز سے جس کے
پھر زندہ و پائندہ ہوئی حکمتِ یوناں

وہ شمعِ دل افروز بجھی بادِ اجل سے
تھی جس کی ضیا رونقِ محفلِ دوراں

تھے جس سے دل و دیدۂ احباب منور
رخشندہ تھی انجم کی طرح بزمِ ندیماں

اس خاک پہ بخشش کے برستے رہیں انوار
اس خاک پہ رحمت کی گھٹا ہو گہر افشاں

کتبہ عبدالمجید پروین رقم
غلام رسول مہر

مقامِ وفات شفا منزل لاہور

تاریخ وفات ۱۰ شعبان ۱۳۵۶ھ

مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء

بروز شنبہ پانچ بجے شام

حکیم فقیر محمد چشتی ضلع جگت اور پھبتی کہنے میں اپنی مثال آپ تھے، ان کا یہ دستور تھا کہ جو مریض اُن کے پاس آتا اسے نسخہ لکھ دیتے، اور فیس کا مطالبہ نہ کرتے، سالک صاحب نے ایک روز اُن سے کہا کہ وہ نسخہ لکھنے کی فیس کیوں نہیں مانگتے؟ حکیم صاحب نے فرمایا "جی مانگنے کی کیا ضرورت، فقیر کی صورت ہی سوال ہے" اب ایسی مستیاں کہاں ملتی ہیں؟

میانی صاحب کا ایک خطہ باغ گل بیگم کے نام سے موسوم ہے۔[۵] اس خطے میں مشہور شاعر اور ادیب پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم کی قبر ہے، ان کی لوح مزار پر بڑے موٹے حروف میں یہ عبارت کندہ ہے؛

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقد

استاد شاعر ادیب

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

تاریخ وفات

۷؍ فروری ۱۹۷۸ء

باغ گل بیگم ہی میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے کابل، ماسکو اور انقرہ کے ساتھی ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی دفن ہیں، ان کے سوانح حیات کافی دنوں تک روزنامہ امروز لاہور میں "انقلابی کی سرگذشت" کے عنوان سے طبع ہوتے رہے ہیں، ان کی قبر بر لب سڑک ہے، اور اس کی

۵۔ گل بیگم یا گل بہار بیگم مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مسلمان بیوی تھی، وہ مہاراجہ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد کافی مدت تک زندہ رہی، اس نے اپنا مزار اپنی حیات ہی میں بنوالیا تھا، یہ پورا خطہ گورستان اسی کی طرف منسوب ہے۔

یہ عبارت منقوش ہے؛

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

نیست در بیشۂ من خشک و تر کوتاہی
چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم

آخری آرامگاہ

انقلابی مجاہد ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی

ولد

میاں غلام علی چٹھہ

جائے ولادت پورہ ہیران۔ شہر سیالکوٹ

بعمر تقریباً ۸۵ سال

بروز اتوار بتاریخ ۱۳؍ جنوری ۱۹۷۴ء مطابق ۱۷؍ ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ

بمقام احمد ولا سمن آباد لاہور وفات پائی،

سر شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا

اسی احاطہ قبور میں بر لب سڑک باغیچہ جسٹس محمد رفیق میں داغ دہلوی کے ایک شاگرد منشی محمد الدین فوق محو خواب ابدی ہیں، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے؛

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال و الاکرام

مرقد منور مجدد کشامرہ منشی محمد الدین فوق

کرد رحلت محمد الدین فوق
بود شاگرد داغ پاک ضمیر

شاعرِ نکتہ دان مدیر و ادیب　خوش بیاں خوش مزاج خوش تحریر

چار دہ از مہ ستمبر　روز جمعہ بسوئے ملک کبیر

گفت تاریخ رحلتش سیمابؔ

انتزاع　مورخ کشمیر

۱۹۴۵

تاریخ پیدائش ۲۵ فروری ۱۸۷۵ء　تاریخ وفات ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

فوقؔ صاحب نے کشمیر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، اس لئے انھیں "مورخ کش
کہتے ہیں، ماہنامہ شیرازہ سرینگر نے ۱۹۸۱ء میں فوق نمبر شائع کرکے ان کی علمی و
کاوشوں کا اعتراف کیا ہے۔

موجودہ صدی کے آغاز میں لاہور میں مشاعروں کا بڑا رواج تھا، ایک بار
یہ مصرع طرح دیا:

ع :۔ فوقؔ صاحب گلی میں رہتے ہیں

شاعروں نے اس پر طبع آزمائی شروع کر دی اور "گلی گلی میں رہتے ہیں، تیری گ
میں رہتے ہیں" جیسے مصرعے ہو گئے ہیں۔

احاطہ طاہر بندگی کے شروع ہی میں بوٹا پہلوان کی قبر ہے، اس کی قبر پر جو ک
نصب ہے اس پر داغؔ کی کہی ہوئی تاریخ درج ہے، پوری عبارت یہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ

وہ دلاور اور وہ شہزور دنیا سے گیا　جس کی شہزوری سے تھا شیر ژیاں منفعل

داغؔ نے یہ مصرع تاریخ برجستہ کہا　رستم زماں آہ بوٹا پہلوان دیو دل

۱۳۲۲ھ

میاں محمد بوٹا پہلوان صاحب رستم ہند نے بعمر ساٹھ سال مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۴ء
مطابق ۳۰ محرم ۱۳۲۲ھ کو انتقال کیا۔

داغؔ کے تاریخ کہنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بوٹا پہلوان کی شہزوری کا چرچا
دور دور تک تھا، میں نے تحقیق نہیں کی، ہو سکتا ہے کہ یہ تاریخ داغؔ کے مطبوعہ
کلام میں نہ ہو۔

بوٹا پہلوان کی قبر سے دس بارہ قدم کے فاصلہ پر آغا حشر کی قبر ہے، آج سے
ربع صدی پہلے اس پر جو کتبہ نصب تھا، اس پر "مزار اقدس فخر ملک و قوم آغا حشر" کندہ
تھا، یہ کتبہ کوئی سنگ فروش اکھاڑ کر لے گیا، اب اس پر جو نیا کتبہ لگایا گیا ہے، اس پر
یہ عبارت منقوش ہے۔

مزار پُر انوار آغا سید محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

المعروف (بہ) انڈین شیکسپیئر حضرت آغا حشر کاشمیری

اظہار عقیدت مبنی بر حقیقت

ایک ایک تمثیل تیری وقت کا تھی شاہکار　پھر گئی تیری دہائی مچ گئی تیری پکار

تیری تصنیفات کے اوصاف اتنے بے شمار　لکھنے بیٹھوں میں تو صبح حشر بھی ہو نمودار

پھر بھی نظم و ضبط سے باہر ہو جولانی تیری

بند سے باندھی گئی کب حشر طغیانی تیری

۲۸ ماہ اپریل ۱۹۳۵ء

تماراج خاک پائے حشر ادیب العصر منشی دل لکھنوی

عقیدت کیشان و خادمین غلام حسین کتھک اصغر نظامی، عاشق جٹ

آغا حشر کے مزار کے سرہانے برّعظیم پاک و ہند کے نامور عالمِ دین، تحریکِ آزادی

کے ایک مجاہد، مولانا خواجہ عبد الحئی فاروقی سابق شیخ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ابدی نیند سو رہے ہیں، ان کی قبر کے سرہانے لوہے کی ایک تختی پر یہ عبارت لکھی ہوئی

آرامگاہ

خواجہ عبد الحئی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش ۱۸۸۸ء

تاریخ وفات ۸ر جنوری ۱۹۶۵ء

۴ر رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ

بروز جمعۃ المبارک　　　بوقت ایک بجے

خواجہ عبد الحئی فاروقی مولانا عبید اللہ سندھی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، وہ قرآن حکیم کی تفسیر اپنے استادہی کے رنگ میں کیا کرتے تھے، ادارہ اصلاح و تبلیغ لاہور نے اُن کے افاداتِ قرآن سات جلدوں میں شائع کئے ہیں، تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں جو گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں، ان گرفتار شدگان میں خواجہ صاحب بھی تھے،

قبرستان میانی صاحب میں برلب بہاولپور روڈ ایک مختصر سے احاطۂ قبور میں جو زینب بیگم بیوہ خواجہ غلام حسین کی طرف منسوب ہے، شاعرِ رومان اختر شیرانی محوِ خواب ابدی ہیں، ان کی سادہ سی لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے،

خواب گاہ حضرت ابو المعانی اختر شیرانی مرحوم

اک شاعرِ نوجوان کی تربت　　　داماں خرابۂ زائرین ہے

۹ر ستمبر ۱۹۴۸ء

اختر شیرانی کی قبر سے بمشکل دس گز کے فاصلہ پر سڑک کے پار لاہور کے ایک نامور صحافی و نقاد علامہ محمد عبد اللہ منہاس کی قبر ہے، اُن کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یاایتھا النفس المطمئنۃ ۰ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ۰ فادخلی فی عبادی ۰ وادخلی جنتی ۰

منہاس مردے بے مثال　　　ہمدرد ملت، خوش خصال

بے باک نقاد و مدیر　　　آن صاحبِ علم و کمال

چوں زیں جہاں بگذشت، یافت

اکرامِ قربِ ذی الجلال

۱۳۶۸ھ

۱۵ر رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ　　　۱۲ر جولائی ۱۹۴۹ء

قبرستان میانی میں سب سے اہم مزار حضرت شیخ محمد طاہر بندگیؒ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ہے، حضرات القدس اور زبدۃ المقامات میں ان کا ذکر موجود ہے، موصوف حضرت مجددؒ کے صاحبزادوں کے استاد بھی تھے، ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یطہرکم تطہیرا

ہبط انوار

قطبِ جہاں　　غوثِ زماں　　فردِ دوراں　　شہبازِ لامکاں

برہان شریعت سلطان طریقت بحر حقیقت گنج معرفت

شیخ المشائخ حضرت شیخ محمد طاہر بندگی نقشبندی مجددی چشتی صابری

قدس سرہ العزیز

شاہ طاہر والا رتبت مظہر نور خدا

کاملاں را پیر کامل سالکان را رہنما

۸ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۰ اگست ۱۶۳۰ء

بروز پنجشنبہ بوقت چاشت

احاطۂ طاہر بندگیؒ میں ایک چبوترے پر مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار ایم اسلم کے خاندان کے افراد دفن ہیں، اسی چبوترے پر ایک کونے میں مشہور شاعر اور ماہر تعلیم ایم ڈی تاثیر کی قبر ہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد ڈاکٹر محمد دین تاثیر

تاریخ وفات ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء

آج میں دور بہت دور نکل آیا ہوں

شاہراہوں سے پرے دور، گذرگاہوں سے

بے طلب بے تگ و دو

ہوس خام نہ سودائے تمام

یونہی چلتا ہوا چلتا ہوا آپہنچا ہوں،

پے بہ پے گام بہ گام

کس قدر دور بہت دور نکل آیا ہوں،

(تاثیر)

یادگار محبت نصب کردہ بیگم تاثیر، سلمیٰ تاثیر، مریم تاثیر، سلمان تاثیر[۵۵]

یہ تاثیر کی ایک آزاد نظم کے اشعار ہیں جن کا انتخاب غالباً پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے جو تاثیر کے رفیق کار اور اردو زبان کے بہت بڑے ادیب تھے، کیا تھا، اصل نظم تاثیر کے مجموعۂ کلام۔ آتشکدہ ۔ میں بعنوان "راہرو" موجود ہے، اور وہ یوں ہے،

آپ سے آپ بہت دور بہت دور نکل آیا ہوں،

شاہراہوں سے پرے دور گذرگاہوں سے

بے طلب، بے تگ و دو

خانقاہوں سے الگ، دور صنم خانوں سے

ہوس خام نہ سودائے تمام

یونہی چلتا ہوا چلتا ہوا آپہنچا ہوں،

پے بہ پے، گام بہ گام

کس قدر دور بہت دور نکل آیا ہوں

اس سے بہتر لوح مزار راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری، قبرستان کے سنسان ماحول میں جب ان اشعار پر نظر پڑتی ہے، تو پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کس قدر "دور"

---

۵۵ یہ کتبہ کوئی سنگ تراش اکھاڑ کر لے جا رہا تھا، کہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا، اس لئے جب اسے دوبارہ نصب کیا گیا تو آخری سطر زیر زمین آگئی،

بہت دور نکل آیا ہوں،

تاثیر بڑے اچھے شاعر تھے، اُن کا یہ شعر تو اب ضرب المثل بن چکا ہے،

داورِ محشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ — اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

ان کا یہ شعر بھی دل میں رکھ لینے کے لائق ہے،

یہ رہِ شوق، رہِ عشق ہے اے اہلِ ہوس — منزلیں آتی ہیں اس میں نہ مقام آتے ہیں

اور تاثیر کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے،

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے اُن سے کہدی — بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

تاثیر مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے اپنے احباب کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

میری وفائیں یاد کرو گے — روؤ گے فریاد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں — کب تک اس کو یاد کرو گے

احاطۂ طاہر بندگی میں "پیسہ اخبار" لاہور کے مدیر منشی محبوب عالم ابدی نیند سو رہے ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں ان کا اخبار جو پیلے رنگ کے کاغذ پر چھپتا تھا، ایک پیسہ میں آتا تھا، ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:-

خواب گاہ خلد آشیاں خادمِ اسلام حاجی مولوی محبوب عالم مرحوم و مغفور

سحر گاہے بگورستاں رسیدم — در آں گورِ پُر انوار دیدم

معلّیٰ تربتِ محبوب عالم — زہاتف تاریخش شنیدم

۱۳۵۲ھ

ایک طالب علم میری نگرانی میں امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی پر تحقیق کر رہا ہے، مورخہ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۲ء کو ہم دونوں امیر المجاہدین کے فرزند مولوی محمد سلیمان کا انٹرویو لینے وزیر آباد گئے، وزیر آباد سے تین کلو میٹر کے فاصلہ پر موضع کرم آباد واقع ہے جسے مولانا ظفر علی خان مدیر زمیندار لاہور کے مولد و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے، اب کرم آباد کی آبادی وزیر آباد کی آبادی سے مل گئی ہے،

وزیر آباد سے سیالکوٹ جانے والی سڑک کے کنارے مولانا ظفر علی خاں کا شاندار بنگلہ آتا ہے، ان کی رہائش گاہ سے متصل ایک بڑی خوبصورت مسجد ہے، جو مولانا ظفر علی خاں نے بڑے اہتمام کے ساتھ تعمیر کرائی تھی، مسجد کے عقب میں آموں کے باغ میں ایک چبوترہ پر مولانا ظفر علی خاں، اُن کے برادر خورد غلام حیدر خاں، ان کی اہلیہ محترمہ اور فرزند اختر علی خاں ابدی نیند سو رہے ہیں، مولانا ظفر علی خاں کی لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابائے صحافت

ظفر الملت حضرت مولانا ظفر علی خاں رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۴ر جنوری ۱۸۷۳ء — وصال ۲۷ر نومبر ۱۹۵۶ء

نہ کی روزی نے رق اس نے میری سرکشی پر بھی — خداوندانِ لندن سے مرا پروردگار اچھا

(مولانا ظفر علی خاں)

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر — اس کی حقیقتوں کے شناسا تم ہی تو ہو

(مولانا ظفر علی خاں)

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے — یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

(مولانا ظفر علی خاں)

(کرم آباد اکتوبر ۱۹۳۶ء زمانۂ نظر بندی)

(خاکپائے اسلاف مسعود علی خاں)

مولانا ظفر علی خاں کی علالت اور بڑھاپے کے زمانے میں اُن کے اکلوتے فرزند اختر علی خاں نے زمیندار کی ادارت سنبھالی، موصوف اپنے والد کے بعد دو سال سے بھی کم عرصہ زندہ رہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجاہدِ ملت

حضرت مولانا اختر علی خاں رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۶ر دسمبر ۱۸۹۴ء — وصال ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵[illegible]ء

رونقِ بزمِ جہاں وہ محفل آرا چل بسا — جس کی فرقت تھی نہ یاروں کو گوارا چل بسا

ہر غریب و بے نوا کی جو بچھا دیتا تھا پیاس — حیف دریائے سخاوت کا وہ دھارا چل بسا

وہ کرم آباد کے گلشن میں اس کی گھن گرج

اب نہ آئے گا وہ شیرِ بن ہمارا چل بسا

خاکپائے اسلاف

مسعود علی خاں،

روزنامہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خاں کا ذکرِ خیر مہرؔ و سالکؔ کے بغیر نامکمل رہیگا، یہ دونوں زندگی بھر کے ساتھی ایک ہی قبرستان میں دفن ہیں، پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس کے قریب مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں ان کی قبریں ہیں۔ مہر صاحب کی قبر بغیر کتبے کے ہے اور سالک صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

ولادت ۱۳ر دسمبر ۱۸۹۴ء — وفات ۲۷ر ستمبر ۱۹۵۹ء

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے — چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے — جبینِ دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے — تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر — جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا،

یہی سرخی بنے گی زیبِ عنواں ہم نہیں ہوں گے

(سالکؔ)

بزمِ صوفیہ

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

یہ بزمِ صوفیہ کا تیسرا اڈیشن ہے جو بہ کثرت اضافوں کے ساتھ چھپا ہے، اس میں تیموری عہد سے پہلے کے اصحابِ تصانیف اکابر صوفیہ مثلاً حضرت شیخ ابو الحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندرؒ، شیخ برہان الدین غریبؒ، حضرت سید جلال الدین بخاریؒ مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ وغیرہ کے حالات و سوانح، تعلیمات و ارشادات اُن کے ملفوظات اور ان کی تصنیفات کی روشنی میں قلمبند کئے گئے ہیں، اس میں حضرت شیخ احمد عبدالحق نوشہ ردولویؒ کے حالات و تعلیمات مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے ہیں، جو حضرت نوشہ کے مقدس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے

قیمت:- ۲۵ روپے، "منیجر"

اسلام اور مستشرقین

پر

دارالمصنفین کا بین الاقوامی سمینار

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۶)

جناب مفتی سیاح الدین کاکاخیل کے مقالہ کے بعد جناب عابد رضا بیدار صاحب ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے ایک سوال کے ذریعہ یہ جاننا چاہا کہ اگر پاکستان میں مستشرقین کی رد میں کوئی کام ہو رہا ہو تو وہ اس مجلس میں سامنے آنا چاہیے، اس کا جواب جناب طفیل احمد صاحب نے یہ دیا:

مستشرقین اور قرآن کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ جناب مولانا عبد القدوس ہاشمی نے تحریر فرمایا جو پہلے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر میں طبع ہوا، اس کے بعد اس کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے، اور جب ہمارے ادارہ تحقیقات اسلامی نے اپنے کام کو تقسیم کیا تو اس میں ایک خاص شعبۂ اسلام اور اس کے درپیش مسائل کے نام سے قائم کیا گیا اس شعبہ کے ذریعہ اسلام سے متعلق جو غلط افکار و خیالات رائج ہو رہے ہیں، ان کی تردید اور ان کے جوابات لکھنے کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے، پنجاب یونیورسٹی سے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی مختلف جلدیں شایع ہوئی ہیں، ان میں مستشرقین کے قسم کے مقالہ نگاروں کے مضامین میں جو غلط فہمیاں ہوتی ہیں ان کا ترجمہ کرتے وقت ان کی نشان دہی کی جاتی ہے اور ان کی نشان دہی اس طرح کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے یہ غلطیاں آئیں اور وہ ان کے جوابات دینے کے لیے آمادہ ہوں، ہمارا ادارہ بھی مستشرقین کی تحریروں کو پڑھتا ہے اور ان کے گمراہ کن دلائل کے جوابات دینے کی پوری کوشش کرتا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی مجموعۂ قوانین اسلام کی مختلف جلدوں کا

ذکر کیا، جو ان کے ادارہ سے شایع ہوئی ہیں، ان کے خیال میں ان جلدوں سے اسلامی قوانین کے متعلق مستشرقین کی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد خاکسار نے ڈاکٹر طفیل صاحب کو اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے سامعین سے یہ کہہ زحمت دی کہ جس شوق سے وہ اس سمینار میں دور دراز مقام سے سفر کر کے شریک ہوئے ہیں امید ہے کہ اسی شوق سے حاضرین ان کا مقالہ سماعت فرمائیں گے۔

ڈاکٹر محمد طفیل صاحب میرے مقالہ کا موضوع ہے "جوزف شاخت اور اصول فقہ" مقالہ کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور تیسرے حصہ میں سے تھوڑا سا اقتباس پڑھنے کی اجازت چاہوں گا، شاخت صاحب کا ایک اقتباس ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ اسلامی قانون براہ راست قرآن حکیم سے اخذ نہیں کیا گیا، اسلامی قانون کا خمیر بنی امیہ کے انتظامی عمل سے اٹھایا گیا اور یہ کہ بعض اوقات بنی امیہ کا عمل قرآن حکیم کے الفاظ پر بھاری ہو جاتا ہے، میں اس کے جواب میں کچھ عرض کرتا جاؤں گا، مذکورہ بالا امور میں سب سے پہلا قرآن حکیم کے قانونی ماخذ ہونے کے بارے میں ہے کہ ابتدائی دور میں قرآن سے بحیثیت ماخذ قانونی استفادہ نہیں کیا گیا یہ کلیہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، ہمیں شاخت کا یہ اصول اور یہ عندیہ محل نظر دکھائی دیتا ہے، نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شرابیوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بہت سے لوگوں کو ملک بدر کیا گیا، نکاح و طلاق، نیز وراثت کی تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کیے گئے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن حکیم کے یہ سارے احکام مسلمانوں میں ابتدائی دور سے ہی اپنا لیے گئے تھے اور ان پر عمل ہوتا رہا، اس کے علاوہ دوسری بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قرآن حکیم یقینی طور پر تمام جزئیات کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ وہ قانون اسلامی کے

اصولوں سے ہمیں روشناس کراتا ہے، شاخت صاحب نے نتائج اخذ کرتے وقت غالباً جزئیات کو پیش نظر رکھا ہوگا، اسی وجہ سے انھوں نے ٹھوکر کھائی ہے، دوسری بات یہ کہ اسلامی قانون کو بنی امیہ کے دور میں قانونی شکل اس وقت ملی جب بنی امیہ کا عمل اس میں داخل ہوا، یہ بھی ایک ایسی تاریخی غلطی ہے جو شاخت کے تعصب کی غماز ہے، دوسری بات یہ کہ حدیث شریف دوسری صدی تک موجود نہ تھی، اس کے علاوہ انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ جب حدیث نبویؐ کو جمع کیا گیا اس وقت وہ اصلی حالت میں موجود نہ تھی، اس میں معاشرتی عمل بھی شامل ہوگیا تھا، گویا سنت نبویؐ جو ہمارے قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، وہ بھی صحیح معنوں میں ہم تک نہیں پہونچ سکا، بلکہ اسے تاخیر سے مرتب کیا گیا، اور جب مرتب کیا گیا تو اس میں معاشرتی عمل بھی شامل ہوگیا، اس حقیقت سے جوزف صاحب نے غالباً آنکھیں بند کرلیں کہ حدیث کو جمع کرنے کا عمل عہد صحابہ رضی میں شروع ہوگیا تھا اور بہت سے صحیفے، صحیفۂ صادقہ، صحیفۂ حضرت علی جو آج تک ہمارے سامنے آچکے ہیں وہ صحابۂ کرام کے دور ہی میں مرتب ہوچکے تھے، بعد میں حدیث کے ذخیرہ کو صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کی شکل میں جمع کر دیا گیا، اور ان کا یہ کہنا کہ جب حدیث کو جمع کیا گیا تو بنی امیہ کے دور کا معاشرتی عمل شامل ہوگیا، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ مسلمان کے لیے نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:

من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ — جس نے میری طرف قصداً جھوٹ کی نسبت کی

مقعدہ من النار — اس کو جہنم میں اپنا مقام بنالینا چاہیے

اس حدیث کی موجودگی میں کوئی کیسے جرأت کرسکتا ہے کہ معاشرتی عمل کو حدیث کا درجہ دے، پھر ہمارے یہاں جرح و تعدیل کا جو اتنا وسیع ذخیرہ اور اتنا بڑا قانون موجود ہے اس کے پیش نظر ہم کھرا کھوٹا الگ کرسکتے ہیں اور پرکھ سکتے ہیں، اور آج بھی ہمارے پاس یہ قاعدے اور کلیے

موجود ہیں تاکہ ہم یہ الگ کرکے دکھادیں کہ یہ حدیث ہے، اور یہ حدیث کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، چاہے وہ معاشرہ کا عمل ہو، یا کسی کی گھڑی ہوئی کوئی بات ہو، ان حقایق کی موجودگی میں جوزف شاخت نے ہمارے قانون کے ماخذ کا درجہ گھٹانے اور اس میں تشکیک و شبہہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ہمیں ان کے تعصب کی ایک سازش نظر آتی ہے، جس کو حقیقت اور تاریخی شواہد سے کوئی تعلق نہیں، ان الفاظ پر میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

اس مضمون کے خاتمہ کے بعد خاکسار نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے شاید آپ سوال نہ کریں، اس لیے اب ہمارے صدر صاحب اپنے تاثرات بیان کریں گے۔

سید حامد صاحب حضرات! وقت کم ہے، میں تبصرہ میں وقت نہیں لوں گا، پاکستان کے علمائے کرام کا یہ زریں سلسلہ آپ کے سامنے آیا، انھوں نے اپنے خیالات، اپنے تجربات، اپنی بصیرت سے آپ کو آگاہ کیا، پہلے فاضل مقرر کے متعلق میں عرض کرچکا ہوں کہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے جس سادگی کے ساتھ بہت سے مسائل کو طے کیا، اس میں ادب کی تنقیدی زبان کو اگر استعمال کیا جائے تو اسے سہل ممتنع کہا جائے گا، یہ بات صحیح ہے کہ مستشرقین نے جس عناد کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً کیا، اس میں اس ذہنیت کو بھی دخل ہے جو ماضی میں کسی مفتوح کو فاتح سے رہتی ہے، جناب شرف الدین صاحب نے مستشرقین، استشراق اور اسلام سے متعلق اپنا مقالہ پڑھا، اور استشراق سے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یقیناً قابل توجہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ استشراق یعنی بہ تکلف مشرقی بننا، اب اگر کوئی شخص بہ تکلف مشرقی بنتا ہے تو ظاہر ہے اس میں بناوٹ تو آہی جاتی ہے، لیکن مستثنیات میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کوئی شخص عقیدت کی بنا پر مشرقی بننا چاہتا ہے، مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے بڑی فراست کے ساتھ اس طرز عمل کی نشاندہی کی ہے کہ مستشرقین کا ایک گروہ یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ شروع میں قلوب و اذہان کو متاثر

کرے، اور یہ تاثر قائم کرے کہ مصنف غیر جانبدار بلکہ ہمدرد ہے، اور پھر اس کے بعد دو چار باتیں ایسی کہہ دے جو ہمیشہ کے لیے جراحت کا سامان رکھتی ہوں، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جن کتابوں کے ترجمے کیے جائیں ان کے حواشی میں اس کا التزام رکھا جائے کہ جن باتوں سے مترجم کو اختلاف ہے، اس کی تردید اور توجیہ ہو سکے، جناب محمد طفیل صاحب نے اپنے مقالہ میں جوزف صاحب کی دو باتوں کی تردید کی ہے، ایک تو یہ کہ قرآن کو فقہ و اسلامی قانون کا مصدر نہیں بنایا گیا، اور دوسری بات یہ کہ حدیث کا وجود دوسری صدی تک نہ تھا، اور جب اس کو مدون کیا گیا تو اس میں بنی امیہ کا معاشرتی عمل بھی شامل ہو گیا، اس کی بہت مدلل تردید آپ نے کی، میرے خیال میں اب اس مجلس کو ختم کیا جائے۔

چوتھی نشست

چوتھی نشست کی صدارت جناب حکیم محمد سعید دہلوی ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان نے کی، اس کی کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے انجام دیے، آغاز جناب حکیم محمد سعید صاحب نے سورہ بقرہ کے آخری رکوع کی تلاوت سے کیا، مقالہ خوانی شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے کہا کہ اس میں سب سے پہلا مقالہ جناب مولانا تقی الدین ندوی کا ہے جن کے مقالہ کا موضوع السنۃ مع المستشرقین والمستغربین ہے، اس کو جناب مقالہ نگار نے عربی میں لکھا ہے، میرے ذمہ جو ناخوشگوار فرض ہے اس کا اثر متعدد اصحاب پر پڑے گا، اور میں کانفرنسوں میں شریک ہوتا رہتا ہوں لہذا خود بھی اس کا شکار ہوتا ہوں، زیادہ سے زیادہ وقت جو ایک مقالہ نگار کو دیا جا سکتا ہے وہ پندرہ منٹ ہے، لہذا میری رائے یہ ہے کہ مقالہ نگار حضرات پورا مقالہ پڑھنے کے بجائے اس کا خلاصہ پیش کریں، یا اس کے اہم اقتباسات کو پڑھیں، اس لیے کہ دس منٹ سوالات اور بحث و مباحثہ کے لیے بھی ہوں گے، مجھے یہ گذارش پہلے تو ڈاکٹر تقی الدین صاحب سے کرنی ہے، اور ان کے بعد

اور مقالہ نگار حضرات سے بھی ہے۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

مولانا نے پہلے عربی میں اپنے مقالہ کے اقتباسات پڑھے اور پھر اردو میں اس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے خاص طور سے سیرت اور سنت کے باب میں مستشرقین کے اقوال کا جو مواخذہ کیا ہے اور ہم کو جو راہ بتائی ہے اس کے متعلق ارادہ تھا کہ میں بھی کچھ لکھوں، ہندوستان میں جب انکار حدیث کا فتنہ پیدا ہوا تو سید صاحبؒ نے اس کے خلاف السنۃ وما الحاجۃ الیہا لکھی جو عربی میں بھی چھپی ہے، یہ مشہور و معروف کتاب ہے، میں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے، میں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ مستشرقین کے انکار حدیث سے نئے تعلیم یافتہ لوگ متاثر ہوئے ہیں جن میں بڑے اہل قلم، اہل زبان شامل ہیں اور جن کا عالم عربی اور عالم اسلام میں بڑا اثر ہے، مثلاً احمد امین، انھوں نے جس طرح حدیث کے بارہ میں خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا کوئی تعلق اسلام اور اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ احمد امین نے علمی خطا کی ہے، یہ علمی غلطی نہیں تحریف ہے، وہ گولڈ زیہر اور اس قسم کے دوسرے مستشرقین سے اتنا متاثر ہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا ہے، اسی طرح موجودہ علماء میں استاد فواد سزگین ہیں جن کی بڑی شہرت ہے، اور ان کی کتاب تاریخ التراث العربی بڑی اہم کتاب ہے، اس کتاب کی دوسری جلد میں انھوں نے تقریباً تیس ۳۰ صفحوں کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس میں انھوں نے علم حدیث کے تطورات تفصیلات اور کتابت کے بارہ میں مختلف رایوں کا اظہار کیا ہے، اس میں سے بعض اقتباسات میں نے اس مقالہ میں نقل کر دیے ہیں، امام بخاری کے متعلق انھوں نے سخت تنقید کی ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاری کے زمانہ سے گویا اسناد میں انحطاط کا دور شروع ہوا بدأ الامام البخاری من الانحطاط فی الحدیث، یعنی امام بخاری کے زمانہ سے گویا اسناد کی اہمیت کم ہو گئی، کتاب الصحیح میں امام بخاری کا

جو مقصد ہے اس کو فواد سزگین سمجھے نہیں، امام بخاری نے تقریباً تیرہ سو[۱۳۰۰] معلق حدیثیں، یعنی بغیر سند کے نقل کی ہیں لیکن ان میں اکثر احادیث کی اسانید امام بخاری نے کتاب کے اندر خود نقل کر دی ہیں، سوائے ایک سو تینتالیس[۱۴۳] حدیثوں کے، اور ان حدیثوں کی اسناد کو حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب تغلیق التعلیق میں بیان کر دیا ہے، اس کتاب کو ایک صاحب نے ایڈٹ کیا ہے اور وہ چھپ بھی گئی ہے، اس میں رجال و رواۃ پر حافظ ابن حجر نے پوری گفتگو کی ہے، امام بخاری نے حدیث معلق کو ضمناً اور استشہاد کے طور پر نقل کیا ہے، وہ اصل کتاب کا موضوع نہیں، لیکن فواد سزگین نے مستشرقین سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ گویا امام بخاری نے اسناد کی اہمیت کو کم کر دیا ہے، پھر جب فواد سزگین سے مناقشہ کیا گیا کہ یہ تو بڑی علمی غلطی ہے، حدیث معلق کے معنی وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، تو وہ اپنی رائے سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں، وقت ختم ہو گیا ہے۔

مولانا تقی الدین ندوی کے بعد جناب مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا، مقالہ کا موضوع تھا نظرۃ خاطفۃ علی موضوع الاسلام والمستشرقین، مولانا نے اردو میں بھی اس کا خلاصہ زبانی پیش کیا۔

مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی

مولانا نے فرمایا کہ میں کم سے کم وقت لوں گا، الاسلام والمستشرقین کے موضوع پر دار المصنفین کے اندر اس اجتماع کا منعقد ہونا اور ہندوستان اور باہر کے بڑے بڑے لوگوں کا جن کا علمی مقام و درجہ ہے، حصہ لینا اس بات کی خوش خبری ہے کہ ان شاء اللہ اس موضوع کا حق پوری طرح سے ادا ہوگا، اسی کے ساتھ اس بیداری کا بھی پتہ چلتا ہے جو ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر اور عالم اسلام میں پائی جاتی ہے، اس قسم کا کوئی بھی اجتماع کسی بھی اسلامی ملک میں ہو سکتا تھا لیکن ہندوستان کا استحقاق کچھ کم نہیں ہے، اس سلسلہ میں دار المصنفین کی نمایاں خدمات ہیں، اور جس کی صدارت میرے رفیق و دوست مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ذمہ ہے، اس لیے اس کا زیادہ

استحقاق تھا، اور یہ اجتماع یہیں ہونا چاہیے تھا، اسی کے ذیل میں میں نے اپنے مقالہ میں دار المصنفین کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے، یہاں سے شائع ہونے والی کتابوں کا بھی نام لیا ہے، جو ایک طرح سے سارے عالم اسلام کے لیے قیمتی سرمایہ ہے، مستشرقین کے بارہ میں میں اپنے تاثرات کا اظہار مختصر طریقہ پر کر دینا چاہتا ہوں، میں نے یہ لکھا ہے کہ مستشرقین کی جو خدمات ہیں ہم کو ان کی قدر کرنی چاہیے، اس کی طرف سے غفلت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان کی کوششوں کی بدولت بہت سی قیمتی قدیم کتابیں حاصل ہو سکیں، جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں تھے، اور وہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دفن تھیں، یہ بہرحال بہت قیمتی چیزیں ہیں اور ان سے ہم بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن مستشرقین کی کوششوں کے سلسلہ میں ہم کو چند باتیں مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو کوششیں ہماری قدیم کتابوں کو شائع کرنے کے سلسلہ میں کی ہیں وہ کسی بڑے مقصد کے لیے نہیں تھیں، بلکہ درحقیقت ان کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب یورپ کا سیاسی غلبہ ساری دنیا پر ہو چکا تھا اور اسکی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ مشرق کے افکار و حالات سے واقفیت حاصل کی جائے، اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مستشرقین سامنے آئے، دوسری چیز جس کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ چاہے یہ لوگ جو بھی خدمات انجام دے رہے ہوں ان میں استثناء ضرور ہے، لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کے اثرات سے بالاتر نہیں ہو سکے ہیں، اور ایسے بہت کم لوگ ہیں جو حق کو جاننے کے بعد اس کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، میں نے مثالیں دی ہیں کہ کس کس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو مجروح کرنے اور اسلام کو غلط شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام اور مستشرقین کے سلسلہ میں اپنے ان مختصر خیالات کے بعد میں نے

دو تین باتوں پر خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک مستشرقین کو یہ مقام حاصل رہے گا کہ وہ علوم اسلامی کے سلسلہ میں سند و مرجع سمجھے جاتے رہیں، اس وقت تک بلاشبہہ ان کو موقع ملتا رہے گا کہ وہ مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہیں، اس لیے ہمیں غافل نہ رہنا چاہیے ہم کو آگاہ ہو کر مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہنا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کیا کوششیں ہو رہی ہیں، تاکہ ان کا مناسب جواب دیا جاسکے، دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے فضائل، مناقب اور محاسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے مثبت انداز میں ہمیں چیزیں شایع کرنی چاہئیں، جن کا علمی اور تحقیقی لحاظ سے درجہ بہت بلند نہ ہو تو مستشرقین کی کتابوں سے فروتر بھی نہ ہو، اس لیے کہ اس کے بغیر ہم لوگوں کو ان کی کتابوں کے مطالعہ سے باز نہیں رہ سکتے، جب تک کہ اس کا صحیح بدل نہ مہیا ہو، آخری بات جس پر میں نے زور دیا ہے کہ جہاں یہ دونوں باتیں ضروری ہیں کہ ان کی غلط باتوں سے واقف ہونے کے بعد بروقت تردید کی جائے، اور اسلام کے تعارف کے لیے نئی نئی چیزیں شایع کی جائیں وہاں میرے نزدیک سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم اسلام کو ایک زندہ نمونہ کے طور پر دنیا کے سامنے اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل کے ذریعہ لانے کی کوشش کریں، تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ واقعی اسلام کیا ہے، رسول اللہ صلعم کی سیرت کیا تھی، ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ رسول اللہ صرف مسلمانوں کے رسول نہ تھے، بلکہ آپ تمام دنیا کے لیے ہادی و رہنما بنا کر بھیجے گئے تھے، اور آپ ہی کی دینی تعلیمات میں ساری مشکلات و مسائل کا حل مستتر ہے، جن سے اس وقت دنیا دوچار ہے،

آخر میں میں اپنے محترم دوست سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انھوں نے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دے کر مجھے اس کا موقع عنایت فرمایا کہ میں آپ حضرات کے افکار و خیالات سے استفادہ کرسکوں اور باہر کے اور ملک کے گوشہ گوشہ سے جو مہمان آئے ہیں

ان کی ملاقات سے مشرف ہوسکوں، والسلام علیکم۔

ظفر اسحاق صاحب مولانا کے اس مقالہ کے بعد جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب نے کہا کہ مولانا کے اس مقالہ میں بڑی قیمتی تجاویز ہیں اور بڑے قیمتی مشورے ہیں، خاص طور پر مسلمان اہل علم کے لیے، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے، اس لیے کہ علمی میدان میں کام کرنے والے خواہ سب لوگ نہ ہوں، لیکن اسلام پر عمل کرنے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے، اور جب تک اسلام کا صحیح نمونہ سامنے نہ آجائے، اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے، ہم کچھ کہیں لیکن دنیا کی ریت یہی ہے کہ وہ درخت کو اس کے پھل سے پہچانتی ہے، تو ہم سب مولانا کے ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں کے لیے ان کے شکر گذار ہیں، ابھی متعدد اہم مقالے پیش ہونے ہیں، اگر کوئی انتہائی اہم سوال ہے تو اس کی گنجایش موجود ہے، لیکن اگر کوئی بہت زیادہ اہم سوال نہیں ہے تو میری گذارش ہے کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اگلے مقالہ نگار کو زحمت دوں، اس کے بعد جناب سید حامد صاحب وایس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دعوت دی جاتی ہے آپ کے مقالہ کا عنوان ہے "عوامل اور رد عمل"۔

سید حامد صاحب سید حامد صاحب نے فرمایا کہ میرے خیال سے وقت بہت کم ہے، میں شروع میں چند عنوانات کا ذکر کیے دیتا ہوں، جو وقت بچے گا اس میں کچھ حصہ پڑھ دوں گا، پہلا عنوان یہ ہے کہ مستشرقین سے ہمیں گلہ کیوں ہو۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم کہ با من انچہ کرد آں آشنا کرد

یعنی ہم نے جب سے تحقیق کے میدان کو چھوڑا اور اس کو یہ کہکر مستشرقین کے سپرد کر دیا کہ تم آؤ اس میدان میں، اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا، اس سلسلہ میں ہم کو مستشرقین سے کیا شکایت ہوسکتی ہے، لیکن اس سے زیادہ شکایت ہم کو اپنے سے کرنا چاہیے، مستشرقین کے انداز بیان کا اگر مطالعہ کیا جائے

تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ خطرات ہوئے اس وقت ان کے اعتراضات کی شدت بڑھ گئی، اور جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کو خطرہ نہیں رہا تو ان کے اعتراضات میں کچھ کمی آئی، یہ اتار چڑھاؤ برابر ہوتا رہا، اس آخری دور میں مستشرقین نے ایک خاص روش اختیار کی ہے، جس میں وہ کھل کر اور شدت کے ساتھ مخالفت نہیں کرتے ہیں، بلکہ سلیقہ اور قرینہ سے وہ اعتراضات کرتے ہیں جو بعد میں خلش و خلفشار کا باعث ہوتے ہیں، مستشرقین کے پہلے ادوار اور اس دور میں یہ بھی فرق ہے کہ پہلے ان کے مخاطب زیادہ تر اہل یورپ اور اہل عالم ہوتے تھے، اب ان کا روئے سخن اہل اسلام کی طرف ہے اور ان کی کوشش یہ ہے کہ اب مسلمان راسخ العقیدہ نہ رہیں، بلکہ وہ شبہات سے دوچار ہو جائیں، یہ سمت کا فرق ایک اہم بات ہے جس کی طرف میں توجہ دلاؤں گا، ہندوستان میں ہماری ملت ۲ حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک تو وہ ہے جو دین کا پاسبان ہے، دوسرا وہ ہے جو جدید تعلیم سے واقف ہے، ملت کی یہ تقسیم خطرہ کا نشان ہے، اور اگر ہم نے اپنے ان طلبہ اور ان بچوں کو جو جدید تعلیم پاتے ہیں ان کے دین اور ان کی تہذیب سے واقف نہ کرایا تو مستشرقین کے خلاف ہماری کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں گی، میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ مستشرقین کے عناد اور ان کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہمارا ردعمل ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے، ہم تدبر اور سنجیدگی سے کام نہیں لیتے، ہم یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے بڑی اسلام دشمنی کی ہے، لیکن کبھی سنجیدگی سے یہ نہیں سوچتے کہ جتنی محنت انھوں نے کی ہے اس کا سواں حصہ بھی ہم من حیث القوم کرتے اور ہماری کتابیں بھی چھائی ہوئی رہتیں تو ہم کو مستشرقین سے شکایت نہ ہوتی، ہم نے جو کچھ کام کیا ہے اس کو انگریزی زبان میں منتقل کرنا ضروری ہے، کیونکہ انگریزی زبان عالمی زبان ہو گئی ہے، بہت کچھ جو ہم کر رہے ہیں یا جو قابل قدر تحقیقی کام کیے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں، جو انگریزی یا یورپ کی زبانوں میں منتقل ہوئے ہوں، میں نے یہ بھی عرض کیا ہے اور اس میں

میں مولانا ابواللیث صاحب سے متفق ہوں کہ اقوال سے زیادہ اعمال کے ذریعہ موثر تردید ہوتی ہے اس کی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، مستشرقین جب تک مسلمانوں سے دور رہے ان کے عناد میں شدت رہی اور جب وہ مسلمانوں کے قریب آئے تو مسلمانوں کے بارہ میں ان کا رویہ بدلنا شروع ہوا، اس کے بہت سے شواہد ہیں، شاعری میں ایک صنف ہے تضمین، اور اقبال نے غنی کاشمیری کے ایک شعر پر تضمین کی ہے جو غالباً اردو زبان کی سب سے بہتر تضمین ہے، میں اس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اس کے بعد اقبال نے بتایا ہے کہ ہم جہاں بین و جہاں بان و جہان آرا تھے، اسلام کی عظمت کا ذکر کیا ہے، پھر وہ کہتے ہیں ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا
غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

گویا اہل فرنگ نے ہماری دولت، سطوت اور اقتدار تو چھینا ہی تھا، ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ یعنی ہمارے علوم بھی چھین لیے، کتابوں سے مراد علوم ہی نہیں وہ زاویۂ نگاہ بھی ہے جو علم کا سرچشمہ ہے، ہم سے وہ زاویۂ نگاہ چھین لیا، ہم سے جستجو اور آرزو چھین لی، ہم سے وہ جذبہ چھین لیا جو حقیقت کی تہ تک پہونچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے، جو علم کے وسیلے کائنات کو تسخیر کرتا ہے، جو انسان کے ذہنی افق کو بے کراں اور اس کے حوصلہ کو فلک تگ و تاز بنا دیتا ہے، کتابیں ہاتھ سے کیا گئیں، آفاق کی قیادت ہاتھ سے چھن گئی، بینش رفعت کا اسم اعظم حافظہ سے محو ہو گیا، جو صاحب ایجاد تھے زندانی تقلید بن گئے، جو عہد آفریں تھے وہ عہدی ہو گئے، ہماری کاہلی اور ہماری جہالت نے یہ دن دکھایا کہ ہمارے علوم و فنون، ہماری ادبیات، ہماری تاریخ و جغرافیہ، سب اغیار کے ہاتھوں میں

چلے گئے، ان سب کے لیے ہم دست نگر ہو گئے، چنانچہ ہم اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو مغرب کی نگاہ سے دیکھنے لگے، اب ہم شکوہ سنج ہیں کہ اہل مغرب نے اپنی کتابوں میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا، مستشرقین کا رویہ ہمارے ساتھ غیر منصفانہ اور معاندانہ رہا، کوئی ہمیں بتا تا کہ ؎

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اقبال ہماری نادر کتابوں کو یورپ میں دیکھ کر درد سے تڑپ اٹھا، اس نے اس میں ہمارے علمی افلاس کی داستان عبرت پڑھی، یورپ کو شغل علم سونپ کر ہم جہالت کے نہاں خانوں میں چھپ گئے، گویا ایک فرض تھا جس کو ہم ادا کر چکے، ایک بوجھ تھا جس کو ہم اتار چکے، اپنی پشت سے ہم نے علم کا پشتارہ پھینک کر دم لیا اور اب ہم شکایت کرتے ہیں کہ مستشرقین نے ہماری اس طرح حق تلفی کی، ہمارے ساتھ یہ ظلم کیا، علم اور تحقیق، ریاضت اور جستجو سے کنارہ کش ہو کر ہم ہی نے تو انھیں دعوت دی تھی کہ ہم چلے، اب سیاہ و سفید تمھارے ہاتھ میں ہے، اب اگر انھوں نے ہمارے نامۂ اعمال کو سیاہ کر دیا تو حیرت کیا؟ شکایت کیوں؟ قدرت خلاء کو گوارا نہیں کرتی چنانچہ علم کو جب ہم نے چھوڑا تحقیق سے جب ہم نے منھ موڑا تو اہل مغرب نے اس خلاء کو پر کیا، اب ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ ہمارے ساتھ انصاف کریں گے، ایک خیال خام ہے، ان کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ ہمارے دین، ہماری تاریخ اور تہذیب کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں جس سے ہم دیکھتے ہیں، ایسی بات کی امید کرنا ہے جو ناممکن ہو، نارمن ڈینیل نے اپنی کتاب "اسلام اور مغرب"، "تاثرات کی تشکیل" میں اسلام کے متعلق مغرب کے رویہ، احساسات، رد عمل اور نگارشات کا جائزہ لیا ہے، کتاب کے آغاز میں جو لکھا ہے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، نقل کفر کفر نہ باشد گویا یہ بیشتر مستشرقین کے طرز عناد کا اعتذار ہے اس سے ان کی نیت کا اندازہ ہوتا ہے، فاضل مصنف کہتا ہے کہ جب تک اسلام ایک بڑھتی اور چڑھتی ہوئی طاقت تھا، اس وقت تک مغرب کے عیسائی اس کو اپنے مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے تھے

اس وقت وہ مسیحیت کے دفاع کے لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر اگلتے رہے، انھوں نے ٹھان لیا تھا کہ اسلام کے چہرہ کو داستانوں، روایتوں اور افواہوں کے سہارے کتابوں میں اس قدر مسخ کر کے پیش کیا جائے کہ اہل یورپ کو رغبت کے بجائے اس سے کراہت ہونے لگے، چنانچہ انھوں نے اسلام کا رشتہ بت پرستی سے جوڑنے میں بھی تامل نہ کیا اور سارا یورپ مسلمانوں کو بت پرست سمجھنے لگا، ستم بالائے ستم اس دین کو جو فرد کی مسئولیت، سادگی، فقر و ریاضت، راستی اور عبادت پر اس قدر زور دیتا ہے، انھوں نے ہوسناکی اور عیش پرستی کا مجموعہ قرار دیا، مسلمانوں کی تعریف بھی اگر کبھی کی تو عیسائیوں کو غیرت دلانے کے لیے یعنی مسلمان جو گمراہ اور سیہ کار ہیں، وہ بھی تم زوال آمادہ عیسائیوں سے بہتر ہیں، ڈینیل صاحب کا یہ تجزیہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کے متعلق یوروپین رائے عامہ کو کسی قدر درست کرنے میں ان اکابر کا بھی دخل ہے جو مسیحی اور صلیبی جنگوں میں ان سے ٹکرائے، ان میں سر فہرست نام صلاح الدین ایوبی کا ہے جن کا نام صلادین بن کر یورپ کے گھر گھر پہونچ گیا، صلاح الدین کی شجاعت، انصاف، رحم دلی، فراخ دلی، رافت و لطف نے انھیں یورپ میں بھی ہیرو کے منصب پر فائز کیا، کسی یوروپین بادشاہ کو وہ عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، حالانکہ انھوں نے عیسائیوں کو شکست فاش دی تھی، یہ بات عبرتناک بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ مسلمانوں کے اقبال کے دور میں یہودی اور عیسائی اس بات سے تقویت و توانائی حاصل کرتے تھے کہ کلام مجید میں ان کے مذاہب کا ذکر ہے، وہ ان کا دور مغلوبیت تھا، رابرٹ نے لکھا ہے کہ اگرچہ شریعت اسلامی بہت سے مقامات پر ہم خیر ہے مبصرین کو ان میں ہمارے مسیحی مذہب کے منشور کی تقدیس اور فضیلت کی سب سے بڑی شہادت اور سب سے مضبوط بنیاد ملتی ہے۔

سید حامد صاحب کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ظفر اسحاق انصاری صاحب نے کہا کہ سید سلمان ندوی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، دار المصنفین اور یہ جگہ ان کا اپنا گھر ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے آپ خلف رشید ہیں اور جنوبی افریقہ میں اسلامی علوم و تاریخ کے استاد ہیں۔

| ڈاکٹر سید سلمان ندوی | ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنی تقریر کا آغاز کیا اور کہا کہ امیر مینائی کا ایک

بہت مشہور شعر ہے ؎

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

سید حامد صاحب نے ابھی اپنا مقالہ پڑھا، ان کے خیالات اور میرے خیالات خاصے ملے ہوئے ہیں لیکن (مزاحاً) ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے بالکل پوچھا نہیں ہے، ہماری غربت و افلاس کا آج یہ عالم ہے کہ ہمارے مسلم طلبہ ایوروز کو تو جانتے ہیں، ابن رشد کو نہیں جانتے، اوی سینا کو جانتے ہیں، ابن سینا کو نہیں جانتے، رازیز کو جانتے ہیں، رازی کو نہیں جانتے، حد یہ ہے ہمارے افلاس کی کہ جبرالٹر کو جانتے ہیں جبل الطارق کو نہیں جانتے، یہ وہ مثالیں ہیں کہ جن سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تعلیم ہم نے حاصل کی وہ کہاں سے حاصل کی اور وہ کس رخ پر لے جا رہی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب میں شکاگو یونیورسٹی میں تھا، اور وہاں تاریخ اسلام کا کورس لیا تھا تو اس وقت وہاں کی بہت مشہور مستشرقہ پروفیسر نبیا ایبوٹ تھیں، وہ بہت سی کتابوں کی مصنفہ ہیں، ان کی کتاب "عائشہ دی بیلوڈ آف پرافٹ" بہت مشہور ہے، لیکن ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "نارتھ عربک اسکرپٹ" ہے، اور جس طرح مستشرق شاخت کا جواب فواد سزگین نے دیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر ظفر اسحاق نے بتایا، اسی طرح نبیا ایبوٹ نے نارتھ عربک اسکرپٹ کی دوسری جلد میں شاخت کا بہت مدلل جواب دیا ہے۔ ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

تو ملے، کعبے سے نہیں ملے، وہ میرے والد مرحوم سے بھی واقف تھیں، میرے والد صاحب سے ان کا ایک علمی مناظرہ اسلامک کلچر حیدر آباد دکن کے رسالہ میں ہوا تھا، یہ مناظرہ لفظ ہمایونی پر تھا، یعنی ہمایونی کا مطلب رائل ہے، یا اس کا مطلب خود بادشاہ ہمایوں سے ہے، انھوں نے مجھے ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا جس کا عنوان تھا "اسلام اور مسیحیت دو بہنیں ہیں" میں نے اس میں یہ لکھا کہ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ دونوں کا منبع ایک ہے، تو بس کافی ہے، مشابہت یہیں ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد جو اختلافات اور بنیادی فرق تھے میں نے ان کو ظاہر کر کے ان کے سامنے پیش کیا تو ان کا ریمارک یہ تھا کہ میں اپنے مذہب کا دفاع کرنا چاہتا ہوں، مطلب یہ تھا کہ میں اگر کچھ آبجکٹیو یعنی معروضی ہوں تو پھر مجھے کچھ تنقید بھی کرنی چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اور جو علمی تحقیقیں کی ہیں ہم اس کا انکار نہیں کرتے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی ہمارے گھر پر ڈاکہ ڈالتا رہے اور ہم اسے احسان سمجھتے ہوئے اپنا سر جھکاتے رہیں، مستشرقین کے درجات ہیں، مشنریاں ہیں،

پادری ہیں اور دوسرے لوگ ہیں، درجہ بدرجہ یہ لوگ مختلف دور میں بدلتے رہے اور اب اور آج سے چند سال قبل مستشرقین سول سروس میں بھی موجود تھے، جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی حکومت کو بتائیں کہ کس قوم سے ان کا واسطہ ہے، یہ حکومت کو اطلاع بہم پہونچاتے اور مشورہ دیتے رہے کہ کس طرح ان سے نپٹا جائے، ایران کے واقعہ کے بعد صدر کارٹر نے مستشرقین اور چند مسلم مصنفین اور اسکالرز کو جو امریکہ میں تھے، دعوت دی اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں ان کی ایک کمیٹی بنائی، جس نے ان کو یہ مشورے دیے کہ ایران کو کس طرح کنٹرول کیا جا سکتا ہے، یہ فریاد بے کار ہے اور یہ شکوہ بے سود ہے کہ کس مستشرق نے کیا لکھا اور کیوں لکھا، اگر وہ نہ لکھتے تو مستشرق ہی کیوں کہلاتے، ان کا انداز بدل گیا، اس وقت سب سے زیادہ ہمدرد مستشرق ڈاکٹر منٹگمری واٹ ہیں، جن کو آج عالم اسلام میں مقبولیت حاصل ہے، اور میں انتہائی تکلیف و الم کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلم ریاستوں کی سیرت کانفرنسوں میں ان کو دعوت دی جاتی ہے، پاکستان کی سیرت کانگریس میں بھی وہ بلائے گئے اور ابھی چند ماہ ہوئے جب میں کراچی میں تھا تو ایک اور مستشرق کو دعوت دی گئی، ٹی۔ وی پر ان کا انٹرویو لیا گیا، جن لوگوں نے ان سے انٹرویو لیا وہ اور بھی زیادہ غریب الفہم اور غریب الفکر تھے، وہ ان سے سوال [illegible] کے متعلق رائے پوچھ رہے تھے، رسول صلعم کی نبوت کی شہادت ان سے چاہتے تھے، منٹگمری واٹ کی کوئی کتاب بھی آپ پڑھیں وہ طنز سے خالی نہیں، ان کی ایک کتاب جس کو عالم اسلام میں بڑی ہمدردی سے دیکھا گیا اور جس کی بنا پر یہ سمجھا گیا کہ وہ اسلام کے ہمدرد ہیں، اس سے ایک اقتباس سنیے جس میں وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے، وہ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم سے خطا و نسیان ہوئے، مگر وہ قصداً نہیں تھے، آپ ان کو معاف کر دیجیے کہ یہ غلطیاں ہوا ہی کرتی ہیں، دوسرے اقتباس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اگر رسول اللہ صلعم کی حیات کو دیکھیں تو ان کے اپنے عہد کے مطابق ان کی زندگی بڑی اچھی اور صاف ستھری تھی لیکن ہاں آج کل کے معیار سے ان کی ذات ویسی اعلیٰ نہیں سمجھی جا سکتی ہے۔" جو ذہن کچا ہے وہ ایسی باتیں کسی نقد کے بغیر قبول کر لیتا ہے، میں ایک دوسری چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں

جس کا رونا نہیں ہے اور بقول سید حامد صاحب ہماری فریاد اپنے آپ سے ہے، مسلمان اسکالر، پروفیسر، ٹیچر جو اس وقت یورپ، امریکہ اور افریقہ میں ہیں جب یہ چاہتے ہیں کہ نصاب میں ایسی کتابوں کو داخل کریں جن کو مسلمان مصنفین نے لکھا ہو تو حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں، ابھی تک سب سے مشہور کتاب جو عام طور سے پیش کی جاتی ہے، وہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی انٹروڈکشن ٹو اسلام ہے، محمد علی لاہوری کی بھی ایک کتاب ہے، ایک کتاب نیاز محمود کی شایع ہوئی ہے، مستشرقین کا رونا نہیں ہے مگر

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ہمارے پاس اس وقت جو سرمایہ اردو میں ہے وہ بڑا کافی سرمایہ ہے، ان سے مستشرقین کے جوابات دیے جاتے رہے، مگر آج کی علمی زبان انگریزی ہے آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں اس وقت اردو زبان کے ذخیرہ سے ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اس وقت ہماری لڑائی ہندوستان پاکستان میں نہیں ہے، لڑائی اس وقت یورپ اور امریکہ میں لڑی جا رہی ہے، اس لیے میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین یا اسی قسم کے دیگر ادارے اپنی تمام کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرنے کا ایک مستقل پروگرام اور ایک جامع منصوبہ تیار کریں اور اس کے لیے خاطر خواہ آدمی مقرر کریں، جن کی انگریزی بہتر سے بہتر ہو، بہت زمانہ ہوا، مولانا شبلیؒ نے ندوہ کے مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ندوہ نے ایک سید سلیمان پیدا کیا، بہت کیا، میں کہنا چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین نے اب تک جو خدمات انجام دی ہیں، وہ بہت قیمتی ہیں، میرا خیال ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنا رول کچھ بدلے، وہ اپنی کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرے، حضرۃ الاستاذ مولانا علی میاں کی کچھ کتابیں انگریزی میں منتقل ہوئیں جن سے ہم کو کچھ سہارا ملا، ہمارے یہاں مستقل ایک کورس ہے، اسلامک پرسنالٹیز پر، لیکن اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں، تاریخ دعوت وعزیمت کا انگریزی ترجمہ ہوا تو وہ بہت کام آئی، مطلب یہ ہے کہ ترجمہ کر سکنے کے لیے باقاعدہ پریس قائم کیے جائیں، طباعت اور اس کی نکاسی کا

بھی پورا انتظام ہو، دوسری تجویز یہ ہے کہ ٹیکسٹ بک، اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کی تیار ہوں، تاکہ یورپ اور امریکہ جائیں تو ہم ان سے فائدہ اٹھا سکیں، یہ فریاد و شکوہ چھوڑ دیں خود جو کرنا ہے کریں۔

ڈاکٹر سلمان ندوی کی اس تقریر کے بعد خاکسار نے چند باتیں عرض کیں، ابھی دارالمصنفین کا ذکر ہمارے بھائی ڈاکٹر سلمان ندوی نے کیا جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ دارالمصنفین کی ساری کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے، دارالمصنفین نے سیرت اور علوم اسلامیہ پر جتنا کام کیا ہے اس پر اس کو فخر ہے، اگر آپ اجازت دیں تو کہوں کہ ایک بار ڈاکٹر اقبالؒ اور سید صاحبؒ کی گفتگو افغانستان کے سفر میں ہوئی تو سید صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحبؒ سے یہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب! جبتک آپ کی شاعری ہندوستان میں پڑھی جائے گی اس وقت تک اسلام ہندوستان میں زندہ رہے گا، ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑے عجز و انکسار سے فرمایا کہ نہیں، جب تک علامہ شبلیؒ اور دارالمصنفین کی کتابیں ہندوستان میں باقی رہیں گی، ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا، اس موقع پر سر راس مسعود بھی موجود تھے، انھوں نے کہا کہ آپ حضرات اس معاملہ میں اختلاف کیوں کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور مولانا شبلی اور دارالمصنفین کا لٹریچر جب تک ہندوستان میں باقی رہے گا، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہاں سے سیرت پر سات جلدیں شایع ہوئی ہیں، صحابۂ کرامؓ پر بارہ جلدیں لکھی گئیں، تاریخ اسلام پر بھی بارہ جلدیں مرتب ہوئیں، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، ائمۂ اسلام، محدثین اسلام، صوفیائے اسلام اور حکمائے اسلام پر بھی بہت سی کتابیں شایع ہوئیں، لیکن اب ہم سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ ہندی میں کر دو، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ان کو منتقل کر دو، ابھی عرب سے جو فضلاء تشریف لائے ہیں، وہ ہماری علمی نمائش دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تو میں نے ذکر کیا کہ سیرت کا ترجمہ ترکی، فارسی، تامل اور گجراتی میں ہو چکا ہے یہ سن کر انھوں نے جب یہ فرمایا کہ کیا عربی ہی ایسی مظلوم زبان تھی جس میں اب تک سیرت کا ترجمہ نہیں

ہو سکا ہے، تو میری گردن ندامت سے ضرور جھک گئی، میں نے عرض کیا کہ سیرت کا عربی ترجمہ اسماعیل ندوی مرحوم نے کیا ہے، لیکن وہ اب تک شایع نہیں ہو سکا ہے، دارالمصنفین کو جو لٹریچر ایک خاص مقصد کے تحت پیش کرنا تھا وہ کر چکا، اب ہم کو توقع یہ ہے کہ جو کتابیں جن لوگوں کو پسند ہیں، کیا وہ ان کے ترجمے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے؟ ہم تو ڈاکٹر سلمان ندوی سے یہ کہتے ہیں کہ تم کو جو وسائل میسر ہیں، ہم تو اپنے محدود ذرائع یا کمی اور مجبوری سے اپنے کام کا پھیلاؤ نہیں کر سکتے، ڈاکٹر سلمان ندوی اور ان کے جیسے دوسرے دانشور اپنے ذمہ یہ کام لے لیں کہ دارالمصنفین کی جو کتاب ان کو پسند ہو اس کو وہ انگریزی زبان یا کسی بھی زبان میں ترجمہ کر دیں، سارا بار ہم پر کیوں ڈالا جائے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی کرو وہ بھی کرو، لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہمارے ذرائع کتنے ہیں، اگر سب کام ہم اپنے ذمہ لے لیں تو جو اصل کام ہے وہ بھی جاتا رہے گا، اس وقت دنیا کے نامور علماء موجود ہیں، ان کو میں یہی دعوت دیتا ہوں، کراچی کی سیرت کانگریس میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ سیرۃ النبی کے ترجمے مختلف زبانوں میں کر دیے جائیں، اور میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں، سیرت پر شاید کسی دوسری زبان میں اتنی مکمل اور جامع کتاب شایع نہیں ہوئی، ہمیں تو توقع یہ تھی کہ جو دوسری زبانوں کے جاننے والے ہیں وہ ہمارا بوجھ ہلکا کریں گے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نہ تو رائلٹی لیں گے نہ کوئی دوسرا مطالبہ کریں گے، ہمارا تو مشن یہ ہے کہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچے، اگر وہ یہ کام اپنے ذمہ لے لیں تو ہم ان کے بڑے ممنون ہوں گے۔

خاکسار کے ان معروضات کے بعد جناب عبدالصبور مرزوق کو دعوت دی گئی، اس موقع پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق رابطۂ عالم اسلامی کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اور آج ہی یوگنڈا سے تشریف لائے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق | ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق نے رابطۂ عالم اسلامی کے مکمل تعاون کا ذکر کیا،

انھوں نے بتلایا کہ سیرۃ النبیؐ کا انگریزی ترجمہ رابطہ کی جانب سے بہت جلد شایع ہونے والا ہے، سیرت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب السیرۃ النبویۃ فی القرآن کا ذکر کیا، رابطہ کے سلسلۂ دعوۃ الحق کی بعض کتابوں کا بھی ذکر کیا، اس سلسلہ نے ایک رسالہ الرسول فی کتابات المستشرقین یعنی 'سیرت رسول مستشرقین کی تحریروں میں' کا ذکر خصوصیت سے کیا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ سب انفرادی کوششیں ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ اسلام کو نئے سرے سے لکھا جائے اور سیرت پر جو کتابیں موجود ہیں انھیں نئے اسلوب اور نئے طرز پر مرتب کیا جائے اور کوشش یہ رہے کہ سیرت کے مثبت پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو سکیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے مسلم طلبہ اب اسلامی علوم میں تخصص کے لیے یورپ کا رخ نہ کریں، خود ہماری عرب یا اسلامی یونیورسٹیاں خود کفیل ہوں اور اسلامی علوم و فنون میں طالب علم کو یہ ضرورت محسوس نہ ہو کہ وہ یورپ جائے اور وہاں علم حاصل کرے، ایک بات ڈاکٹر صاحب نے بہت اہم کہی کہ مستشرقین نے جن کتابوں کو بطور مراجع پیش کیا ہے، ان کا بھی جائزہ لیا جائے، کیونکہ مستشرقین مراجع میں بھی تحریف سے کام لیتے ہیں، لہذا بڑی حد تک ان مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات، شبہات اور اعتراضات کا رد خود ان کے مراجع کے ذریعہ ہی مل جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ سیرۃ النبیؐ کا عربی ترجمہ تیار ہے، اور میری گفتگو اس سلسلہ میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور ان کے دوستوں سے ہوئی ہے، قطر میں سیرت کے ایک بین الاقوامی اجتماع میں یہ طے ہوا تھا کہ اس سلسلہ میں ایک مستقل سکریٹریٹ الامانۃ العامۃ قائم کیا جائے، یہ سکریٹریٹ اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ سیرۃ النبیؐ کا عربی ترجمہ شایع کرے، میں نے اس سلسلہ میں نشاندہی کی تھی کہ اس کے دو حصوں کا ترجمہ ڈاکٹر اسماعیل ندوی نے کیا تھا، پہلا حصہ غالباً شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کے پاس پہونچ چکا ہے یا عبدالحلیم محمد احمد

کے پاس ہے جو بڑے ناشر ہیں، میری ہی نشاندہی پر انھوں نے وہ نسخہ حاصل کر لیا تھا، افسوس ہے کہ ڈاکٹر اسماعیل ندوی کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس کے دوسرے حصہ کا سراغ نہیں مل رہا ہے، وہ ترجمہ مکمل کر چکے تھے، سید صاحبؒ کی سیرت عائشہؓ کا ترجمہ میرے فاضل دوست مولانا ناظم ندوی نے عرصہ ہوا کر لیا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، میرا مشورہ تھا کہ اسے کسی عرب ناشر کو دے دیا جائے وہ اسے شایع کر دے اور وہ وہاں سے بآسانی اہل علم کے پاس پہونچ جائے، لیکن ہمارے فاضل دوست سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کی خواہش یہ ہے کہ وہ دار المصنفین کی مطبوعات کے سلسلہ میں شامل ہو اور وہ ندوہ کے پریس میں چھپے، ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس کا اعلان کیا ہے اور وہ یہ اعلان کرنے کی پوزیشن میں ہیں کہ اس سلسلہ میں رابطہ کی طرف سے جو بھی تعاون ممکن اور مفید ہو، اس کے لیے وہ تیار ہیں۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی کے ان کلمات کے بعد جناب خواجہ احمد فاروقی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ان کے مقالہ کا عنوان تھا "مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر" لیکن تاخیر زیادہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے مقالہ پیش نہیں کیا، اور آخر میں صدر جلسہ جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے صدارتی کلمات ادا فرمائے۔

حکیم محمد سعید حکیم صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ تاخیر بہت ہو چکی ہے، اور اس نشست کو جلد از جلد ختم کرنا چاہیے، لیکن میرا یہ خوشگوار فرض ہے کہ آج کی مجلس کے مقررین کا بصمیم قلب شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے نہایت اہم نکات کی طرف اس موتمر کو متوجہ کیا ہے، اور شکریہ ادا کرتا ہوں ان مقالہ نگار حضرات کا جنھوں نے تاخیر کے سبب اس وقت مقالہ نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور شکریہ ادا کرنا چاہیے ان مترجمین کا جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے

اس فرض کو انجام دیا، میں نے اس موتمر میں التزام سے شرکت کی ہے اور تمام مقالات غور سے سنے ہیں اور مسئلہ مستشرقین اور مسئلہ مستغربین پر احتیاط سے غور کیا ہے، اس موتمر کا رجحان بالعموم یہی رہا ہے کہ مستشرقین نے جو اچھائیاں کی ہیں ان کا اعتراف کیا جائے اور انھوں نے جو قصداً یا شرارتاً غلطیاں کی ہیں ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے، میری رائے اس معاملہ میں یہی ہے کہ اس میدان میں ہمیں قدم بڑی احتیاط سے بڑھانا چاہیے، نہ یہ مناسب ہے کہ ہم لڑائی مول لیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ خاموشی اختیار کریں، اس میدان میں میری اپنی رائے یہ ہے کہ اس موتمر کو اختتام سے قبل کسی حتمی نتیجے پر پہونچنا چاہیے، مجھے توقع ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس موتمر کے منتظمین ان نکات اور ان رموز کو نوٹ کر رہے ہوں گے جن کو بالآخر تجاویز کی شکل دی جاسکے، کیونکہ اگر ہم نے تجاویز مرتب نہ کیں اور لائحۂ عمل مرتب نہ کیا تو یہ احتمال ہے کہ اس اہم موتمر سے وہ نتائج حاصل نہ ہو سکیں گے جس کے لیے ہم نے عزم وارادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں میری ایک تجویز یہ ہے کہ ہمیں اس موتمر کو ایک مستقل شکل دینی چاہیے، یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کانفرنس ہر سال اعظم گڈھ ہی میں ہو اور دار المصنفین پر اس کا بار پڑے، یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے ممالک بھی اس معاملہ میں پیش قدمی کریں اور اس کانفرنس میں یہ طے کر لیں کہ آیندہ کانفرنس اگلے سال کس ملک میں ہوگی، جب تک ہم اس کام کو مستقل اور مرکزی حیثیت نہ دیں گے، یہ کام خوش اسلوبی سے آیندہ انجام نہ پا سکے گا۔

جناب حکیم محمد سعید صاحب کے ان خیالات کے بعد ہی مندوبین حضرات نے کانفرنس کے آیندہ انعقاد سے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا، خود حکیم صاحب کی تجویز تھی کہ یہ کانفرنس ہر سال منعقد ہو، بعد میں جناب یوسف قرضاوی صاحب نے قطر کی طرف سے پیش کش کی کہ وہاں کے شریعت کالج اور مرکز السنۃ والسیرۃ کی طرف سے اگلی بار اس کی مہمان نوازی کے فرائض انجام دیے جائیں گے، لیکن ان کی تجویز یہ تھی کہ اس قسم کے سمینار ہر سال کے بجائے ہر دوسرے سال پر منعقد ہوں، تاکہ اچھی طرح سے تیاری کر لی جائے، یہ سمینار پہلا تجربہ ہے اور پہلے تجربہ میں عموماً کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، تیاری

پوری طرح نہیں ہو پاتی، اگلی بار اس کا اہتمام کیا جائے کہ لوگوں کو سمینار کے انعقاد سے کافی قبل موضوعات دے دیے جائیں، تاکہ وہ سمینار زیادہ مفید نتائج کا حامل ہو۔

اس موقع پر خاکسار نے عرض کیا کہ مجھے اس کی خوشی ہے کہ قطر میں اس کی دعوت دی گئی ہے، لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ۲ دو سال کا وقفہ نہ دیا جائے، اس لیے کہ اس سمینار سے جو جذبات بیدار ہوئے ہیں مجھے اندیشہ ہے کہ ۲ دو سال کے بعد یہ کہیں سرد نہ پڑجائیں ویسے یہ میری ذاتی رائے ہے، میں آپ لوگوں کی رائے کا بھی طلبگار ہوں گا کہ ۲ دو سال کے بعد یہ سمینار کرنا مناسب ہوگا یا ہر سال؟ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اعلان کیا کہ اس سمینار کی ایک کمیٹی ہے جو ان تجاویز پر غور کر رہی ہے اور اس کے بعد ان کو آخری شکل دیکر ان شاء اللہ کل سفارشات آپ کے سامنے پیش کرے گی، میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ پر مزید ہم کسی گفتگو میں وقت صرف نہ کریں۔

اس کے بعد حکیم محمد سعید صاحب نے فرمایا کہ میں جناب محترم سید صباح الدین صاحب کی اس تجویز سے متفق ہوں کہ یہ سمینار ہر سال کرنا چاہیے، بہرحال کمیٹی فیصلہ کرے گی اور امید ہے کہ اگلے سال یہ کانفرنس ان شاء اللہ پاکستان میں ہوگی، لیکن پھر انھوں نے قطر میں اس کانفرنس کے پہلے انعقاد کو بھی پسند کیا، انھوں نے ایک اہم تجویز یہ بھی رکھی کہ اس سمینار کا ایک سکریٹریٹ یعنی ایک اساسی کمیٹی ہونی چاہیے جس کا مرکز دارالمصنفین ہو۔

خاکسار نے اس موقع پر کہا کہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ دارالمصنفین کو اس کا مرکز بنایا جارہا ہے، لیکن میری گذارش یہ بھی ہے کہ اس موقع پر کمیٹی کے ممبروں کے نام بھی تجویز کر لیے جائیں، بہرحال طے یہ ہوا کہ سمینار کی کمیٹی ان سارے امور پر غور کر کے اپنی تجویز آیندہ نشست میں پیش کر دے گی۔

اس کے بعد یہ نشست ختم ہوگئی۔

(باقی)

مطبوعات جدیدہ

دعوۃ القرآن

(تفسیر سورہ فاتحہ و سورۂ بقرہ، و سورہ آل عمران و سورۂ نساء)

مرتبہ جناب شمس پیرزادہ صاحب تقطیع کلاں کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۴۳ قیمت بارہ روپیہ، پتہ۔ ادارۂ دعوۃ القرآن، ۵۹۔ محمد علی روڈ بمبئی، ۳ ۴۰۰۰۰۔

غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ اور مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کے لیے ادارۂ دعوۃ القرآن بمبئی کا قیام عمل میں آیا ہے، اس نے تھوڑے عرصہ میں کئی مفید کتابیں شائع کی ہیں اور اردو، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کا منصوبہ بھی بنایا ہے، ترجمہ و تفسیر کی خدمت جناب شمس پیرزادہ انجام دے رہے ہیں جن کو اچھا علمی و دینی ذوق بھی ہے، اور جو اس سے پہلے بعض عربی کتابوں کا ترجمہ شگفتہ اردو میں بھی کر چکے ہیں، ابھی ابتدا سے سورۂ نساء تک کے ترجمہ و تفسیر کی اشاعت دو جلدوں میں ہوئی ہے، پہلی میں فاتحہ و بقرہ اور دوسری میں آل عمران و نساء کی تفسیر ہے، اسے مرہٹی، گجراتی اور انگریزی میں بھی منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے، اور ان زبانوں میں بعض حصے چھپ بھی چکے ہیں، اردو میں اس سے پہلے قرآن مجید کی متعدد مفید اور بہتر تفسیریں لکھی گئی ہیں، مگر یہ سب عموماً ضخیم ہیں، اور عربیت و تفسیر کی فنی بحثوں اور دقیق مسائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عام لوگوں اور غیر مسلموں کے لئے زیادہ کارآمد نہیں ہیں، اس نئی تفسیر میں فنی اور مشکل تفسیری بحثوں کو نظر انداز کر کے اختصار و جامعیت سے قرآن کے مطالب کی دلنشین تشریح کی گئی ہے، اور موجودہ زمانہ کے شکوک و شبہات کا جواب بھی دیا گیا ہے، اس کی زبان سلیس، اسلوب دلکش،

اور طریقہ بحث واستدلال موثر ہے مصنف نے اختصار کے باوجود اہم مطالب کی بقدر ضرورت توضیح و تشریح کی ہے اور آیتوں کی باہمی مناسبت، سورتوں کے عمود و نظام اور ان کے مضامین کا تجزیہ بھی کیا ہے ایک حد تک احادیث اور بائبل کے حوالے بھی دیے ہیں، اور کسی خاص نقطہ نظر کی جا و بیجا حمایت کے بجائے قرآن کے اصل مقصد کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس لئے اس میں جدید تعلیم یافتہ اشخاص اور غیر مسلموں کے ذوق و تشفی کا سامان ہے مصنف نے اس میں جابجا نقشے بھی دیے ہیں اور آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی ہے، مگر کہیں کہیں ترجمہ ترجمانی کی حد میں آگیا ہے بعض جگہ ترجمہ میں حشو و زوائد بھی ہیں جیسے وَلَاهُمْ يُنْصَرُوْنَ کا "اور نہ وہ کہیں سے مدد ہی پا سکیں گے"، خط کشیدہ الفاظ زائد ہیں اگر یہ مترجم کے نزدیک ناگزیر تھے تو ان کو قوسین میں دینا چاہئے تھا، نیز صیغۂ مجہول کا ترجمہ بلا ضرورت صیغۂ معروف سے کرنا بھی خلاف احتیاط ہے، اسی طرح عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ کا ترجمہ سلیمان کی حکومت کی طرف منسوب کر کے نہ صرف زائد بلکہ غلط ہے۔ "سلیمان کے عہد حکومت میں" کافی تھا، بعض آیتوں کے ترجمہ سے مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہو سکا ہے، حواشی میں اس کی وضاحت ضروری تھی جو نہیں کی گئی ہے۔ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ۔ "مگر جو بات کہی گئی تھی اسے ظالموں نے دوسری بات سے بدل دیا"، ظاہر ہے یہ دوسری بات توضیح طلب تھی، ترجمہ میں گو عربی جملوں کی ترتیب کا ہر جگہ بعینہ لحاظ ممکن نہیں ہوتا، مگر قرآن کے ترجمہ میں جس قدر ممکن ہو اس کی پابندی کرنی چاہئے، لیکن لائق مترجم نے بامحاورہ ترجمہ کے شوق میں اس کا اکثر لحاظ نہیں کیا ہے، مصنف نے بعض آیتوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے ان کے دوسرے مفہوم کا احتمال بھی ہے، اور وہ بہت زیادہ نامناسب بھی نہیں ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی کرنا چاہئے تھا۔

"ض"

جلد ۱۳۰ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۲ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات